مولانا مودودیؒ: مفکر، مصلح اور مدبر

پروفیسر خورشید احمد

بیسویں صدی نے تاریخ کے اوراق پر تباہی اور شکست و ریخت کے بڑے ہولناک نقوش ثبت کیے ہیں' لیکن اس کے ساتھ' فکری اور تعمیری حوالے سے بھی' اس کے دامن میں چند مثبت کارنامے اور بعض افادی پہلو نظر آتے ہیں۔

اُمت مسلمہ ایک طرف بدترین استحصال کا شکار ہوئی تو دوسری جانب اسے استعمار کی غلامی سے نجات بھی ملی اور تیسری جانب اس کے اندر ایسی تحریکیں برپا ہوئیں' جنھوں نے اُمت کے اندر دینی بیداری اور اسلامی شعور پیدا کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ ان تحریکوں کے بعض داعیوں اور رہنماؤں نے مسلمانوں کو بحیثیت اُمت سربلندی اور عظمت کی طرف لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایسی شخصیات میں ایک نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ہے۔

زیر نظر مضمون میں مولانا مودودیؒ کی زندگی کے فکری پہلوؤں پر جو معروضات پیش کی جارہی ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کے فکری و عملی کارناموں کی روشنی میں ہم بھی ایمان' دانش اور عمل کی راہوں کو کشادہ کرتے ہوئے' اپنے زمانے کے درپیش چیلنجوں اور بحرانوں کا مقابلہ کریں۔ دورِ جدید کی تاریخ میں حق و باطل کی کش مکش کا جب بھی ذکر ہوگا' تو اس میں اس دور کی زمانہ ساز شخصیات اور تحریکوں کا بھی لازمی طور پر تذکرہ ہوگا۔ اس تذکرے میں مولانا مودودیؒ کی کاوشوں کو ایک مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

○ پہلا حصہ ۱۹۲۰ء سے [illegible] کر ۱۹۲۸ء تک مولانا مودودیؒ کے فکری تشکیلی دور [illegible] ان کی صحافتی زندگی کا زمانہ بھی کہا جا [illegible] مطالعے اور تحقیق کا زمانہ ہے۔ ایک لحاظ سے اس زمانے کو ان کے دورِ طالب علمی کا تسلسل بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے مختصر خودنوشت شذرات (notes) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ان کا مطالعہ' زیادہ تر قرآن پاک' حدیث نبویؐ اور تاریخ کے علاوہ دورِ جدید کے علمی اور ادبی لٹریچر پر مشتمل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم اُمت کو تہذیبی' سیاسی اور معاشی سطح پر ایک کش مکش کا سامنا تھا' مولانا کو اس کش مکش کا صحیح ادراک اسی دور (۱۹۲۰ء-۱۹۲۸ء) میں ہوا' جس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو اس زمانے میں انھوں نے الجمعیۃ میں لکھے۔ اس علمی اور صحافتی سرمایے کو خلیل احمد حامدی مرحوم و مغفور نے چار جلدوں (آفتاب تازہ' بانگ سحر' جلوۂ نور اور صدائے رستاخیز) میں جمع کرکے محفوظ کردیا ہے۔

Ketabton.com

(c) ketabton.com: The Digital Library

○ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک کے زمانے کو میں دوسرے دور کا حصہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ الجہاد فی الاسلام کی تسوید کا کام ۲۶-۱۹۲۵ء سے شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۷ء کے آخر تک اس کا پہلا مسودہ تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا مودودیؒ صحافت کو چھوڑ کر محقق، مفکر، مصنف اور مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس دور میں انھوں نے تاریخ اور ثقافت سے لے کر حدیث اور فقہ کے مباحث پر بڑی عرق ریزی سے کلام کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے اسلام کے انقلابی تصور کو اس کی تمام جہتوں سمیت دلیل کی قوت سے واضح کیا، اور اس کے ساتھ ہی عصر جدید کے تصورات پر بھرپور گرفت بھی کی۔ اس دور میں مولانا نے قرآن و سنت کے ابدی پیغام کی شرح وبسط کے ساتھ ترجمانی کی، اور یہ ترجمانی اس خوبی اور عمدگی اور اس شان سے کی کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جیسے بزرگوں نے ان کو 'ترجمانِ اسلام' قرار دیا۔ یوں ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک یہ ساری علمی اور قلمی جدوجہد وہ تن تنہا کرتے رہے۔

یہی زمانہ تھا جب ان کے ہم خیال، جاں نثار دوستوں، حلیفوں اور ہم سفروں پر مشتمل ان کے حلقۂ احباب میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ مولانا مودودیؒ اسلامیانِ ہند (خصوصاً مسلم اُمہ اور بالعموم پوری نوع انسانی) کے مستقبل کے بارے میں جو تصور اور وژن (vision) رکھتے تھے اور جو تبدیلی وہ لانا چاہتے تھے، وہ تن تنہا بروے کار نہیں لائی جاسکتی۔ اس مطلوبہ تبدیلی کا تقاضا تھا کہ ایک منظم اور مربوط اجتماعی جدوجہد کی جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ سید مودودیؒ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ بلاشبہہ دورِ جدید میں اسلام کے احیا کے لیے فکری کام بھی ضروری ہے، لیکن اس فکر کو بروے کار لانے کے لیے کسی عملی جدوجہد اور اجتماعی تحریک کے بغیر، یہ عظیم کام نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ تجدید و احیاے دین اور مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش جیسی تصانیف ان کے اس ذہنی سفر کی عکاس ہیں، جو بالآخر ایک صالح جماعت کی ضرورت پر منتج ہوا۔

○ اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کے قیام کے ساتھ ہی اس منظم اجتماعی جدوجہد کا دور شروع ہوتا ہے۔ البتہ اس سے پہلے ۱۹۳۸ء میں علامہ محمد اقبال مرحوم کی دعوت پر حیدرآباد دکن سے دارالاسلام (پنجاب) منتقلی، اور وہاں ادارہ دارالاسلام کا قیام، دراصل اس بڑے کام کا ابتدائی مرحلہ (spade work) تھا، جب کہ اس کی دہلیز (threshold) اگست ۱۹۴۱ء ہے۔ اس تین سالہ عرصے (۱۹۳۸ء-۱۹۴۱ء) میں وہ اُمت کی تعمیر اور اس کے اندر مطلوبہ تبدیلیوں کے لیے ایک متبادل شعور (alternative vision) کی پرورش کرتے رہے اور پھر اس کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ایک ہمہ جہت اجتماعی جدوجہد کا آغاز کیا۔ تیسرا دور ۱۹۴۱ء سے وفات (۱۹۷۹ء) تک کا ہے، جب وہ رفیق اعلیٰ کے بلاوے پر ہم سے رخصت ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور انقلابی دور تھا۔ جس میں سید مودودیؒ کا وژن بھی کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے تھا۔ اس وژن کے مطابق زندگی کے نقشے کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی اجتماعی جدوجہد کے سارے خدوخال بھی صفحۂ قرطاس ہی پر نہیں، بلکہ رنگ و بو کی اس دنیا میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور تفصیلات کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے مجلّے (ترجمان القرآن) سے شروع ہونے والی یہ جدوجہد نہ صرف برعظیم ہی کے طول و عرض میں تہلکہ مچانے کا باعث بنی، بلکہ ایک عالم گیر انقلابی تحریک کا روپ دھار گئی، اور اس چومکھی لڑائی میں سید مودودیؒ کا عالم یہ تھا کہ ؎

ایک دل ہے اور ہنگامِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

اس طرح میں ان کی زندگی کو ان تین حصوں میں تقسیم کر کے غور کرتا ہوں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مولانا مودودیؒ بحیثیت صحافی

اولیں دورِ صحافت میں بالکل نوعمری ہی میں مولانا مودودیؒ نے بحیثیت ایک صاحبِ قلم اور بحیثیت ایک وسیع النظر صحافی کے اپنی منفرد اور غیر معمولی صلاحیت کار کا لوہا منوایا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ انھوں نے تاج' مسلم اور جمعیت العلما کے پرچے الجمعیۃ میں لکھا' بلکہ اس کے ساتھ نگار' مدینہ بجنور اور لاہور کے ہمایوں میں بھی مضامین لکھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ۲۱'۲۲ برس کے نوجوان کو مسلمانوں کی اس وقت کی ایک اہم تنظیم جمعیت العلما کے سرکاری ترجمان کی ادارت مکمل ذمہ داری کے ساتھ سونپی گئی جو مولانا مودودیؒ کی غیر معمولی ذہانت اور ان کے کردار کی پختگی کے ساتھ جمعیت علماے ہند کے قائدین کی مردم شناسی کا مظہر بھی تھی۔ خصوصاً مفتی کفایتؒ اللہ اور مولانا احمد سعیدؒ اس نوجوان سے بے حد متاثر تھے۔ دوسری طرف مولانا محمد علی جوہرؒ بھی چاہتے تھے کہ مولانا مودودیؒ ان کے معاون کے طور پر' ان کے تاریخ ساز اخبار ہمدرد کے عملۂ ادارت میں شامل ہو جائیں۔ مراد یہ ہے کہ اس زمانے میں بحیثیت ایک صاحبِ قلم اور صحافی کے' انھوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ اس زمانے میں مولانا نے ترجمے بھی کیے ہیں اور متعدد مضامین بھی لکھے' لیکن ان کا پہلا کارنامہ صحافت ہے۔

مولانا مودودی کے اس دورِ صحافت میں ہمیں پانچ چیزیں بڑی نمایاں نظر آتی ہیں:

- پہلی بات یہ ہے کہ نوجوانی کے باوجود' ان کی تحریر میں بڑی پختگی ہے۔ الجمعیۃ کے زمانے کے مضامین اور بعد کی تحریروں کو دیکھیں تو زبان' اسلوب' اظہارِ خیال' حسنِ بیان اور رعنائی خیال میں بہت کم فرق نظر آئے گا۔ مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ تحریر میں اتنی کم عمری میں ایسی پختگی' بڑی منفرد اور امتیازی خصوصیت ہے۔ اس سے قبل ہمیں یہ خوبی مولانا ابوالکلام آزادؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ میں نظر آتی ہے اور بعد ازاں یہ چیز ہمیں سید مودودیؒ میں بحیثیت ایک نوجوان صحافی کے نظر آتی ہے۔ البتہ آزاد اور شبلی کے برعکس مولانا مودودی کے ہاں ایک وسعتِ نظر' فکر میں ٹھیراؤ اور زیادہ کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔
- دوسری حیرت انگیز بات ان کے ہاں مطالعے کی ہمہ گیری اور حکمت و دانش کے متنوع ذخیروں سے اخذ و اکتساب کے لیے حیرت انگیز محنت و کاوش نظر آتی ہے۔ دنیا کے حالات سے باخبری' اور نہ صرف گوناگوں موضوعات پر اظہارِ خیال' بلکہ رائے کی پختگی کے نمونے اس زمانے کی تحریروں میں فراواں دکھائی دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ خود اپنی فکر کو سنوار اور نکھار رہے تھے۔ ان کاوشن اسلام کا سرچشمۂ قوت کے مضامین کے ذریعے ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ لہجہ اور وسعتِ بیان ان کی تحریروں کے چار مجموعوں (آفتاب تازہ' بانگ سحر' جلوہ نور اور صداے رستاخیز) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ان مضامین میں وہ پوری شرح و بسط سے بیان کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین اور انسانیت کے لیے ایک آفاقی پیغام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انقلابی تحریک بھی ہے۔ ان مضامین میں مولانا کے ہاں زبان و بیان کی صحت اور اثر انگیزی کے ساتھ ساتھ فکر کی پختگی اور وسعت تہہ در تہہ نظر آتی ہے۔ ایک سہ روزہ اخبار میں خبروں کے انتخاب اور ترجمے کے ساتھ اداریہ نویسی اور کالم نویسی بذاتِ خود بڑا جاں گسل کام تھا' جب کہ معاونت کے لیے اس کا عملہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس متفرق نویسی کے ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے علمی و فکری مضامین بھی لکھتے رہے۔ یہ چیز تحریر و تصنیف پر ان کی ماہرانہ دسترس اور ان کی غیر معمولی دماغی قابلیت کا پتا دیتی ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

● تیسری چیز جس نے مجھے سحر زدہ کیا' وہ مولانا مودودیؒ کی شخصیت میں دماغ اور دل کا نہایت متوازن تعلق ہے۔ دماغ علامت ہے تفکر اور تدبر کی اور دل نمایندہ ہے جذبات' احساسات' توقعات اور خواہشات کا۔ ان میں جب بھی تصادم اور تضاد ہو تو انسان بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا غلبہ ہو اور دوسرا معدوم' تو شخصیت کا عدم توازن رونما ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کے درمیان ایک صحیح توازن ہو تو متوازن شخصیت اُبھرتی اور معتدل فکر رونما ہوتی ہے۔ میں نے اس زمانے میں مولاناؒ کی تحریروں کا جو تجزیہ کیا ہے' اس میں کہیں کہیں فکر پر جذبے کا غلبہ نظر تو آتا ہے' جوانی کی عمر اور اس عہد (age) کے مسائل و مصائب اور حالات کا فطری تقاضا تھا' اس کے باوجود مجھے کہیں بھی عقل کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹتا نظر نہیں آیا۔

مثال کے طور پر ہندستان کے صنعتی زوال اور اس کے اسباب ۱۶۰۰ء-۱۹۲۴ء کے موضوع پر قومی نقطۂ نظر سے' مگر معتدل و متوازن انداز سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے' سید مودودیؒ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''کسی ملک کی اقتصادی و تمدنی حالت پر غور کرتے وقت' سب سے زیادہ توجہ کے قابل یہ امر ہوتا ہے کہ اس کا نظامِ حکومت کیسا ہے؟ یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ قوموں کے بننے بگڑنے میں بڑا حصہ حکومت کا ہوا کرتا ہے۔ کبھی کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کا نظامِ حکومت درست نہ ہو' اور اسی طرح کوئی قوم تباہ نہیں ہو سکتی' تاوقتیکہ اس کا نظامِ حکومت خراب نہ ہو'' (ماہنامہ نگار' اکتوبر ۱۹۲۴ء)۔ اس مضمون میں انھوں نے ہم وطنوں کی اقتصادی بدحالی کا مفصل نقشہ پیش کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر محض ۲۱ برس تھی مگر اس مضمون میں انھوں نے ایک سیاسی مدبر اور ماہر اقتصادیات کی سی پختہ فکر کے ساتھ خرابی کی اصل جڑ کی نشان دہی کی ہے۔ بعد ازاں ۱۹۳۹ء میں انھوں نے زیادہ واضح اور دوٹوک انداز میں یہ مشہور جملہ لکھا: ''حکومت کی خرابی' تمام خرابیوں کی جڑ ہے''۔ حکومت کے کردار کے بارے میں یہ وژن سید مودودیؒ سے پہلے ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ میں بھی نظر آتا ہے۔

اسی زمانے کی شاہکار تصنیف الجہاد فی الاسلام ان کی علمیت' پُرزور استدلال اور توازنِ فکر کی دلیل ہے۔ اسی کتاب کی تصنیف کے دوران انھوں نے عملی صحافت کا میدان چھوڑ دیا۔ صحافت میں موضوع کا کینوس اور دائرہ تخاطب بالعموم محدود ہوتا ہے اور فطری طور پر اس میں وقتی ردعمل اور جذبات کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ سید مودودیؒ نے اپنے مزاج کی مناسبت سے اس میں اپنا مستقبل نہیں دیکھا۔ وہ دل و دماغ کے اس امتزاج کی طرف جانا چاہتے تھے کہ جہاں قلب حرکت' جدوجہد اور ترغیب کا کام تو انجام دے' لیکن عقل اور فکر جس طرف لے جانا چاہتی ہے' وہ کسی حیثیت سے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے یا اس کے اوپر کوئی پرچھائیں یا سایہ نہ پڑ جائے۔ اس زمانے کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ ایک کش مکش سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک فیصلہ کرنا چاہتے تھے اور بالآخر انھوں نے ریل کا کانٹا بدلا اور جس پٹڑی پر چاہتے تھے' اسی پر وہ آگئے اور ہزاروں' لاکھوں انسانوں کو بھی لے آئے۔ اس سے بھی زیادہ فیصلہ کن اقدام ان کی صحافتی زندگی میں ہمیں نمایاں نظر آتا ہے' جس کے تحت وہ ضمیر کی بیداری' خودداری اور حریت کو اولیت دیتے ہیں۔ گویا صحافی' صحافت کو محض قلم کاری نہ سمجھے بلکہ قلم کو فکر اور علم کی ترویج اور فروغ کے لیے ایک ایسا ہتھیار خیال کرے' جو دیانت کے ساتھ استعمال ہوتا کہ وہ دوسروں کی چاکری اور کاسہ لیسی کا آلۂ کار نہ بنے۔

جمعیت العلما' مسلمان علما کی ایک ایسی قابلِ قدر جماعت تھی' جو اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ بنیادی طور پر یہ کوئی علمی تنظیم نہیں تھی بلکہ ایک عوامی تحریک تھی' جس کی قیادت چند جید علما کے پاس تھی۔ تاہم یہی وہ زمانہ تھا کہ جب آہستہ آہستہ جمعیت کی اس وقت کی قیادت کا ایک بڑا حصہ انڈین نیشنل کانگریس کی فکر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ہندستان میں مسلمان اُمت کو جو بنیادی مخمصہ (dilemma) درپیش تھا' اس کا فہم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مولانا مودودیؒ کی فکر اور ان کے حقیقی کارنامے کو ذرا وسیع تناظر میں دیکھا جائے۔ جمعیت العلماء کی قیادت کے بڑے حصے نے وہ راستہ اختیار کرلیا' جس میں اسلام کی جگہ آزادی کو اولیت حاصل ہوگئی۔ یہاں اس چیلنج کو سمجھنا چاہیے جو اس وقت اُمت مسلمہ کو درپیش تھا' اور تاریخ کے مختلف ادوار میں باربار پیش آتا رہا۔ اس چیلنج کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش ہی سے ہم علامہ اقبال اور سید مودودی کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور برعظیم کے سیاسی منظرنامے ہی کو نہیں بیسویں صدی کی پوری مسلم اُمت کی فکر اور سیاست کا بہتر فہم حاصل کرسکتے ہیں' بلکہ اب اکیسویں صدی میں جن حالات' مسائل اور چیلنجوں سے ہمیں سابقہ درپیش ہے' ان کا صحیح ادراک اور ان کے مقابلے کے خطوط کار متعین کرنے میں بھی مدد اور رہنمائی مل سکتی ہے۔

اس میں پہلا مسئلہ سب سے زیادہ گمبھیر تھا۔ وہ یہ کہ ہجرت مدینہ کے بعد سے اٹھارہویں صدی تک' اسلام کا تہذیبی' تاریخی اور عالمی کردار درحقیقت ایک تاریخ ساز اور عالمی طاقت کا کردار رہا ہے جس میں ایک طرف قلب کی اصلاح اور کردار کی تطہیر اور تزکیہ ہے' دوسری طرف معاشرے اور تاریخ و تہذیب کی تبدیلی کا عمل۔ اسلام کا مزاج پہلے دن ہی سے یہی رہا ہے کہ اس نے طاقت کو محض سیاسی اقتدار سے عبارت نہیں کیا' تاہم سیاسی اقتدار' اس کی طاقت کا ایک اہم عنصر ضرور رہا ہے۔ اسلام نے ایمان' دین اور طاقت کے درمیان ایک تعلق قائم کیا۔ اس تعلق کا اظہار صرف سیاسی طاقت ہی میں نہیں بلکہ معاشرے کے سارے اداروں میں ہوا' چنانچہ خاندان سے لے کر ریاست تک' یعنی نظامِ قانون' نظامِ قضا اور نظامِ معیشت' سب کو اس کا حصہ بنایا۔

خلافت راشدہؓ کے فوراً بعد مسلمانوں کو یہ مسئلہ پیش آیا کہ قوت تو اسلام کے پاس موجود تھی' لیکن اس کے لیے جو نظام اور جو ڈھانچا اسلام نے بنایا تھا' وہ متاثر ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے اقتدار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون' اور فقہ کی تشکیل میں بھی بڑی محنت کی۔ فکر مودودی کی روشنی میں یہ کہنا ضروری ہے کہ فقہ کی تدوین اور نظام قضا پر علما کی دسترس' ملوکیت کی انحرافی رو (deviationist wave) کے مدمقابل معاشرے میں ایک ایسے خودکار نظام کو فروغ دینا ایسا تاریخی کارنامہ تھا جس کے نتیجے میں معاشرے اور تہذیب و تمدن پر اسلام غالب رہا اور ریاست بھی اسلام کی گرفت میں رہی۔ سید مودودیؒ نے اس تاریخی کارنامے کو خلافت و ملوکیت میں پیش کیا ہے اور اس میں ہماری تاریخ اور تدوین فقہ کی تحریک کا ایک ایسا پہلو سامنے آیا ہے جسے مورخین اور مفکرین نے بالعموم نظرانداز کردیا تھا۔ بلاشبہہ بارہ سو سالہ اس دور میں اتار چڑھاؤ بھی آتے رہے تھے' لیکن اٹھارہویں کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع میں یہ بات واضح ہوگئی کہ عالمی قیادت میں اب مسلمانوں کا کردار مضمحل بلکہ ختم ہو رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ان کا یہ کردار کم ہوکر بالکل نچلی سطح کو چھونے لگا۔

اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ صورت پیدا ہوئی کہ مسلمان سیاسی اور عسکری طور پر بے وقعت ہونے کے بعد ایک قابلِ ذکر قوت کے طور پر عالمی سیاست کی بساط سے یکسر باہر ہوگئے۔ گویا اقتدار پر ان کی گرفت ختم ہوگئی اور عالمی قیادت میں ان کا مقام اور وقار سرنگوں ہوگیا۔ جب ترکوں نے ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کو ختم کردیا' تو علامتی سطح پر بھی ان کی رہی سہی حیثیت کا خاتمہ ہوگیا۔ اب یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جو حضرات جذباتی ردعمل رکھتے تھے' ان کی ساری توجہ خلافت کو بچانے اور ساری قوت خلافت کو بحال کرنے میں صرف ہوئی۔ لیکن مولانا مودودیؒ' علامہ اقبالؒ اور اسلامی تحریکات کی فکر کا تجزیہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے خلافت کے احیا کو اصل ایشو نہیں بنایا' بلکہ اسلام کے احیا' اسلامی سوسائٹی کے قیام' اور اسلامی ریاست کے حصول و قیام کو اپنا ہدف قرار دیا۔ اس طرح انھوں نے رسمی خلافت کے بجائے خلافت کے جوہر (essence) اور اس کے حقیقی مقصد اور ہدف کو اپنی منزل قرار دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اب ایک بڑا المیہ یہ ہوا کہ سیاسی قوت کے چھن جانے کے نتیجے میں مسلمان دوسروں کے غلام ہو گئے اور ایک دوسری تہذیب ان پر غالب ہو گئی۔ یہ تہذیب جن بنیادوں پر استوار تھی وہ اسلامی بنیادوں کی ضد تھی۔ اس طرح ایک تہذیبی کش مکش شروع ہو گئی جو مسلمانوں کے تصورِ جہاں‘ اقدارِ حیات‘ سماجی ادارات‘ انفرادی کیرکٹر اور اجتماعی مزاج کو متاثر کر رہی تھی۔ اس تہذیبی کش مکش سے نکلنے کے لیے صرف جذباتی ردِعمل کافی نہیں تھا‘ بلکہ ٹھوس فکر اور سوچے سمجھے انداز میں ایک متبادل لائحہ عمل‘ واضح نشانِ منزل اور ایک منظم و مربوط جدوجہد درکار تھی۔ ایک طبقے کے نزدیک اولین ہدف غیر ملکی استعمار سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس طبقے نے اصل ہدف سیاسی آزادی کو قرار دیا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی احیا کے داعیوں کی سوچ یہ تھی کہ غیر ملکی استعمار سے نجات کے لیے جتنی ضروری سیاسی جدوجہد اور آزادی ہے‘ اتنی ہی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ان کے فکری اور تہذیبی غلبے کے خلاف پیکار ایک لازمی مرحلہ ہے۔ اور اگر استعمار کے اس فکری اور تہذیبی غلبے کو نظر انداز کیا گیا تو سیاسی جدوجہد بالآخر غیر موثر رہے گی۔ اس لیے اصل ضرورت یہ ہے کہ اُمت کو دینِ حق کی بنیاد پر اسلام کی بالادستی کے قیام کے لیے تیار کیا جائے‘ اور اسی جدوجہد کو استعمار کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ بھی بنایا جائے۔

یوں اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے بنیادی چیلنجوں کا سامنا تھا۔

اس سیاسی‘ تہذیبی اور فکری پس منظر میں برعظیم کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ برطانیہ نے چونکہ اقتدار ہم سے لیا ہے‘ اس لیے آزادی کے بعد بھی اقتدار ہمارا حق ہے۔ تحریک مجاہدین سے لے کر ہجرت اور ترکِ موالات کی تحریک تک اور جمعیت علماے ہند سے دیگر انگریز مخالف تحریکوں تک کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کی قیادت مسلمانوں کے پاس تھی‘ اور وہی ان میں فعال اور فیصلہ کن حصہ لے رہے تھے۔ درحقیقت مسلمانوں کے دماغ میں یہی چیز تھی کہ آزادی ملنے پر فطری طور پر ہم اقتدار کے وارث ہوں گے۔ لیکن وہ اس جوہری فرق کو نظر انداز کر رہے تھے جو جمہوریت کے تصور پر مبنی اداروں کے قائم ہونے سے یہاں ووٹ کی قوت کے باعث متعارف ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے برعکس ہندو اس کھیل کو بڑی کامیابی سے کھیل رہا تھا۔ اس چیز کو نظر انداز کر کے جمعیت العلماء نے جدوجہد آزادی کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا۔ انھوں نے اپنی دانست میں یہی سمجھا کہ آزادی کا حصول ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا اور واحد مسئلہ ہے۔

دوسری جانب مولانا مودودیؒ اور علامہ اقبالؒ کی فکر یہ تھی کہ فقط مسلمانوں کی آزادی نہیں بلکہ اسلام کی آزادی اصل مسئلہ ہے‘ اور مسلمانوں کو آزادی اگر اسلام کی آزادی کے بغیر ملتی ہے تو وہ غلامی ہی کی دوسری شکل ہو گی۔ اس لیے اسلام کی آزادی اور مسلمانوں کی آزادی دو ہی طرح ممکن ہے۔ یا تو مسلمان اتنے قوی ہوں کہ پورے برعظیم کی باگ ڈور سنبھال سکیں‘ جو بظاہر ممکن نہیں ہے۔ ورنہ پھر انھیں کوئی ایسا راستہ نکالنا پڑے گا جس میں وہ اپنے جداگانہ تشخص کو محفوظ رکھ سکیں اور آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے دین کی منشا اور اپنی ثقافت کے تحفظ کا بھی ٹھیک ٹھیک حق ادا کر سکیں۔ جس بات کو عرفِ عام میں ’دو قومی نظریہ‘ کہا جاتا ہے‘ اس کی فکری بنیاد یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دو جداگانہ نظریہ ہاے حیات کے علم بردار ہیں‘ اور آزادی کا وہی مفہوم انصاف کے تقاضے پورے کر سکتا ہے‘ جس میں ہر نظریے اور تہذیب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملے۔ اس کے لیے سیاسی‘ قانونی‘ ثقافتی‘ غرض ہر میدان میں ایک نئے دروبست کی ضرورت ہو گی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مولانا مودودیؒ کی اس زمانے کی تحریروں میں آزادی، مسلمان اُمت اور ہندستان کے متعلق مسائل و معاملات پر مباحث ملتے ہیں۔ مولانا کا زاویۂ نگاہ اس وقت بھی بڑا واضح تھا کہ اسلام کی آزادی اور مسلمان اُمت کی آزادی اسی وقت ممکن ہے، جب وہ اسلامی تشخص سے وابستگی کو شرطِ اول قرار دے۔ اس تشخص کی وضاحت اور اس کے حصول کے لیے مولانا ہر لمحے سرگرداں اور پریشان نظر آتے ہیں۔ برعظیم ان کی توجہ کا اولین مرکز ہے لیکن اس مرکز کا بیرونی حلقہ (circumference) بڑا وسیع اور دنیا بھر کے مسلمانوں پر محیط ہے، چاہے وسط ایشیا میں کمیونسٹ زاروں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے المناک واقعات ہوں، یا افریقی ممالک میں ظلم و زیادتی کا معاملہ ہو، یا ہندستان میں ہندو انگریز گٹھ جوڑ سے مسلمانوں پر قافیۂ حیات تنگ کرنے کا شیطانی کھیل ہو، وہ ہر مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے احیا کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ مغربی استعمار کے حلیف مسلمانوں کی فکری اور عملی حماقتوں کا بھی پردہ چاک کرتے ہیں جو مسلمانوں اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے دشمن سے بھی زیادہ بدتر کردار ادا کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسی زمانے میں جمعیت کانگرس کے ساتھ مل کر اس راستے کو اختیار کر چکی تھی جسے وہ 'سوراج' کہتے تھے۔ نتیجتاً علاقائی یا وطنی قوم پرستی ان کی نگاہ میں گوہرِ مطلوب بن گیا تھا۔ بالکل یہی سوچ غیرمسلموں کی بھی تھی، اور مسلمان آزادی کی اس جدوجہد میں محض ایندھن کے طور پر استعمال کیے جا رہے تھے۔ یہ وہ کش مکش تھی جس میں مولانا مودودیؒ نے اپنے لیے الگ راستے کا انتخاب کیا۔ اس لیے کہ وہ اپنے قلم کو اپنے ضمیر سے جدا نہیں کرسکتے تھے۔ یہ ان کی صحافت کا چوتھا امتیازی پہلو تھا۔

● ان کی صحافت کا پانچواں پہلو وہ ہے جس کی مثال ہمیں اخبار تـاج، جبل پور [۱۹۲۰ء] کے زمانے میں ملتی ہے۔ تـاج میں نام بطورِ مدیر تاج الدین صاحب کا آتا تھا، لیکن اسے مرتب سید مودودیؒ کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے مولانا مودودیؒ بتاتے ہیں: ''تـاج کچھ مدت تک ہفتہ وار نکلتا رہا، اور پھر روزانہ ہوگیا۔ میں تنہا اس کو چلاتا تھا...... بدقسمتی سے میرے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی۔ چونکہ اخبار کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے تاج الدین کا نام شائع ہوتا تھا، اس لیے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ گو اس طرح میں حکومت کی گرفت سے بچ گیا، لیکن مجھے اس بچنے میں کوئی خوشی نہ تھی، اور آیندہ کے لیے میں نے عہد کرلیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبار نویسی نہ کروں گا، بلکہ اپنی ہر جنبشِ قلم کی ذمہ داری اپنے سر لوں گا''۔ (تـذکرہ سید مـودودی، ج ۲، ص ۱۲۸-۱۲۹)۔ یہ بڑے اُونچے کردار اور جرأت کی بات ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس وقت مولاناؒ ابھی صرف ۱۸ سال کے نوجوان تھے۔ یہ واقعہ ان کے ضمیر کی بیداری اور ان کے کردار کے رخ کو متعین کرتا ہے۔

بحیثیت صحافی یہ امور مولانا مودودیؒ کے زمانۂ صحافت میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کے دور میں بھی اگرچہ مولاناؒ ان معنوں میں تو صحافی رہے کہ ایک ماہنامے کے مدیر تھے اور ایک ماہنامے کا مدیر بھی صحافی ہوتا ہے اور وہ خود بھی اپنے آپ کو صحافی کہتے تھے، تاہم اب ان کی تحریر، ان کی سوچ، اور ان کے انداز میں ایک تبدیلی آئی اور ان کے اہداف اب صحافت کے دائرے سے نکل کر ایک زیادہ اہم، مشکل اور کٹھن میدان میں داخل ہوگئے۔ یہ میدان تھا دین کی صحیح تعبیر، فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید اور عالمی استعماری تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کے کردار کی بازیافت کا۔ انسان سازی اور تاریخ کے دھارے کو تبدیل کرنے کے لیے جن عناصر اور قوتوں کی ضرورت ہے، ان کے لیے فکرمندی مولانا مودودیؒ کے طرزِ فکر اور اسلوبِ زندگی کا ایک مستقل حصہ بن گئی۔ اب وہ ایک مفکر، مصلح، مدبر اور قائد کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مولانا کی نگارشات میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ادب کی چاشنی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں ادب کی یہ جولانیاں شاعرانہ اسلوب کی حدوں کو بھی چھوتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ پر بھی لکھا۔ اسی زمانے میں مشہور مصری دانش ور مصطفیٰ کامل پاشا کی کتاب المسئلۃ الشرقیہ کا ترجمہ کیا۔

ان تمام تحریروں میں وہ اپنے مزاج اور موضوع کی مناسبت سے ادبیت اور مقصدیت کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مولانا کی تحریروں میں ابتدائی زمانے ہی سے ادب کی مٹھاس، صحتِ زبان، حسنِ بیان اور رعنائی خیال کا ایسا امتزاج پایا جاتا ہے، جو ان کے طرزِ نگارش کو ایک انفرادی آہنگ عطا کرتا ہے۔ اولین دور میں مولانا مودودی کے ہاں دو زیریں لہریں (under currents) ہمیں متوجہ کرتی ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے نبرد آزما بھی نظر آتی ہیں: ایک شبلی کا اسلوبِ تحریر، دوسرا ابوالکلام آزاد کا انداز نگارش۔ ایک کی خصوصیت گنگا جمنا کی میدانی علاقوں میں پُرسکون روانی ہے، اور دوسرے میں پہاڑی آبشار اور پتھروں کو بہالے جانے والے پانی کے پُرشور دھاروں کا جوش وخروش۔ ان دونوں اسالیب سے مولانا نے استفادہ کیا ہے۔ دونوں کے کچھ نہ کچھ اثرات مولانا کے اسلوب پر نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا نے دونوں میں سے کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ کسی ایک کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ میرے سوال کے جواب میں فرمایا: ''میں نے خود نیا رنگ لیا''۔ ان کا یہ اسلوب، دورِ صحافت میں تشکیل پاچکا تھا۔ اس لیے میری نگاہ میں الجہاد فی الاسلام مولانا مودودی کے بنیادی فکر ہی کا آئینہ ہے، بلکہ اس کتاب میں مولانا کے اندازِ تحریر اور اسلوبِ نگارش کی امتیازی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ الجہاد فی الاسلام کے لیے تحقیق اور اس کی تحریر وتسوید مولانا مودودیؒ کی زندگی میں ایک کلیدی موڑ اور امکانات کے وسیع افق روشن کرنے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو انھیں اسلام کے تصورِ کائنات کو بالکل واضح حقیقت کے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کا موقع ملا۔ دوسری طرف جو معذرت خواہانہ روایت مسلمانوں کی فکر میں جڑ پکڑ چکی تھی، اس کو انھوں نے بالکل ریزہ ریزہ کرکے رکھ دیا اور پوری متکلمانہ شان کے ساتھ اسلام پر اعتراضات کا دفاع کیا، ان کا جواب دیا اور اس سے بڑھ کر مثبت طور پر اسلام کی ایک جامع تصویر پیش کی۔ اس عمل میں انھوں نے ایک نیا اسلوب بھی اختیار کیا۔ اس علم کلام کی اصل خود اسلام میں موجود ہے۔ الجہاد فی الاسلام، مولانا مودودیؒ کی زندگی کے رخ کو متعین کرنے والی کتاب ہے، اور یہ حسب ذیل تین حوالوں سے ہے:

اول: اسلام کے صحیح تصورِ حیات وکائنات کی بازیافت۔

دوم: یہ نکتہ کہ یہ تصورِ حیات فکری طور پر حق وباطل کی ایک عالم گیر کش مکش کی طرف لے جاتا ہے، جس میں اسلام کا تاریخی، بنیادی اور فطری کردار ہے۔ اس سے اسلام کا تحریکی تصور اُبھرتا ہے جو بالآخر بیسویں صدی میں اسلامی تحریکات کی صورت گری کا ذریعہ بنا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

سوم: یہ کہ اس تقاضاے دین کی بجا آوری اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں ایک مرحلہ پر طاقت کے استعمال کا ایک متعین کردار ہے' وہیں صرف طاقت یا جنگ اس کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ بلاشبہہ یہ ایک ناگزیر پہلو ہے' لیکن ہر دور کے مسائل' معاملات اور زمینی حقائق کی روشنی میں غلبۂ اسلام کے لیے ایسی حکمت عملی وضع کرنا ضروری ہے' جو اس مقصد کے لیے مددگار ثابت ہو اور اس میں مداہنت و پسپائی یا رخصت و دل شکنی کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ مکی دور میں بھی غلبۂ اسلام مقصود تھا' لیکن یہ دور تیاری کا دور تھا۔ جس کی تکمیل اور تنفیذ ہجرت اور اس کے بعد ہوئی لیکن مکہ اور مدینہ دونوں اس تحریک کے لازمی مرحلے ہیں' جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ حرا سے لے کر شعب ابی طالب تک' معراج سے ہجرت تک' بدر سے حنین تک' حدیبیہ سے فتح مکہ تک' سب اس وسیع تر حکمت عملی کے پہلو ہیں اور اس نمونے سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اُمت مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر دور میں حسبِ ضرورت ایک نیا نقشۂ کار مرتب کرے۔ مدینہ کی ریاست کے قیام سے لے کر خلافتِ راشدہ تک کا دور ہی اصل اسلامی مثالیہ (paradigm) ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ زمانۂ خلافت کے بعد غلبۂ اسلام کی کیا حکمت عملی ہو؟ یہ کیسے ہونا چاہیے؟ کیونکر ہونا چاہیے؟ گو اس پہلو کو مولانا مودودیؒ کتاب میں لے آئے' لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت مولانا مودودیؒ پر یہ پوری طرح واضح نہیں تھا کہ یہ کام کیسے کرنا ہے؟ ۱۹۲۸ء سے ۳۹-۱۹۳۸ء تک کا زمانہ مولانا کے فکر کے نکھار کا زمانہ ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مستقبل کے لیے اُمت کے سامنے ایک حکمت عملی پیش کی اور پھر اسے بروے کار لانے کا آغاز کیا۔ ان سنگ ہاے میل اور پیش آمدہ چیلنجوں کے خدوخال مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

بحیثیت مصنف اور ادیب

اس دور کے بھی کئی حصے ہیں۔ ابتدائی چار سال تک تو انھوں نے خاموشی سے' مگر جم کر اور پوری یکسوئی سے مطالعہ اور تحقیق کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھا۔ اس عرصے میں کچھ کتابیں بھی لکھیں' اور مستقبل کے منصوبے بھی بنائے۔ ان کے اپنے عزائم کو پختگی حاصل ہوئی اور رجحانات کی واضح صورت گری ہوئی۔ پھر ۳۳-۱۹۳۲ء میں یکسو ہو کر وہ اپنی زندگی کے اصل مشن کے لیے جہادِ زندگانی کے وسیع میدان میں سرگرمِ عمل ہوگئے۔ میری نگاہ میں اس جہادِ زندگانی کے شروعات کا بہترین اظہار ترجمان القرآن کے پہلے سات برسوں کے 'اشارات' میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ اظہار مولانا کی شخصیت' وژن اور فکر کے ارتقا اور مولانا کے مستقبل کے تاریخی کردار کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ترجمان کی ادارت سنبھالتے ہی انھوں نے جو پہلی چیز لکھی وہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے مضامین ہیں۔ بعدازاں تنقیحات' سود' پردہ' اسلام اور ضبطِ ولادت' تفہیمات کے مباحث ہیں۔ مولانا کے دوسرے دورِ حیات تک کی یہ مختصر سی جھلک ہے۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ کلامی' الٰہیاتی اور سائنسی موضوعات پر کلام کرتے ہوئے وہ مضبوط منطقی استدلال اختیار کرتے ہیں' لیکن جب معاملہ آتا ہے احساسات کو اُبھارنے کا' تو بعض تحریروں میں انھوں نے جھنجھوڑنے والا انداز بھی اختیار کیا۔ اس زمانے کی تحریروں میں مولانا کے ہاں انگریزی اور عربی کے الفاظ نسبتاً زیادہ ملتے ہیں' لیکن ۱۹۴۰ء کے عشرے میں ان کے اسلوب میں آسان زبان اور عام فہم انداز فروغ پذیر ہوتا ہے۔ اس سادہ نویسی کا شاہکار تفہیم القرآن اور خطبات ہیں۔ پھر آخری زمانے تک مولانا کا یہی انداز رہا ہے۔ گویا کہ ادیب کی حیثیت سے بھی مولانا کے ہاں ہمیں ایک ارتقا نظر آتا ہے۔ زمانۂ صحافت میں انھوں نے دوسروں کے کچھ اثرات بھی قبول کیے' اور یہ بالکل فطری بات تھی' لیکن پھر ان کا اپنا طرزِ نگارش اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مولانا مودودیؒ کے طرزِ نگارش کا اگر کسی دوسرے صاحب اسلوب فرد کے ساتھ موازنہ کیا جا سکتا ہے تو وہ برٹرینڈ رسل ہے۔ اس کے ہاں بھی الہیاتی، سائنسی اور تہذیبی موضوعات پر بحث ملتی ہے، جس کو وہ بڑی خوب صورت انگریزی نثر میں پیش کرتا ہے، اور صحتِ بیان اور سہل اسلوب کے ساتھ اظہارِ خیال کرتا ہے۔ بحیثیت ادیب، مولانا کی یہ بڑی قابلِ قدر خدمت ہے کہ انھوں نے اُردو زبان کو علمی، دینی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات سے مالا مال کرتے ہوئے اظہار کی ایک شان دار روایت قائم کی۔ ادب صرف افسانہ نگاری اور شاعری تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے سارے سنجیدہ موضوعات کو مختلف ادبی پیرایہ ہاے اسالیب میں زیرِ بحث لاتا ہے۔ مقالے اور الہیاتی مضامین بھی ادب کے دائرے میں آتے ہیں۔

مولانا مودودی لکھتے وقت الفاظ کے انتخاب میں کسی تکلف میں نہیں پڑتے۔ وہ اپنی توجہ موضوع پر مرکوز کرتے ہیں، الفاظ خود بخود موزوں ہو جاتے ہیں۔ دینی فکر اور معاشرتی علوم کو انھوں نے نہایت خوب صورت زبان میں پیش کیا ہے۔ وہ صنائع اور بدائع کے استعمال میں بھی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو وہ کلاسیکی زمرے میں آتی ہے۔ یہ چیزیں تو اظہر من الشمس ہیں، اس کے ساتھ جو چیز نئی ہے وہ یہ کہ انھوں نے قرآنی اصطلاحات، قرآنی محاورے اور قرآنی پیغامات کو اُردو زبان میں اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ یہ مولانا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا مودودیؒ کی فکری اور ادبی تخلیقات روایتی مذہبی تحریروں سے بڑی مختلف ہیں۔ ان میں فکر کے عمق کے ساتھ زندگی کی حرارت اور ادب کی چاشنی ہے، جس نے ان تخلیقات کو بولتی ہوئی تحریریں بنا دیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ان میں دعوت کی روح اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ وہ حرکت کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ وہ خود بھی بیدار ہیں اور دوسروں کو جگانے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور پھر عمل اور حرکت پر اکساتا ہے۔ مولانا نے طنز اور مزاح کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے، ان کی تحریر میں بلا کی شوخی ہے جو ان کی خوش ذوقی ہی کا ثبوت نہیں، بلکہ ادبی صنعت کاری کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔

آج کل مغرب کے زیرِ اثر ''اسلام کی اصلاح'' کرنے والوں کے لیے ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا کا نام ایک رول ماڈل ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۰ء میں اتاترک پر لکھی گئی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے، ایسے لوگوں کی ذہنیت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا: ''[کتاب اتاترک کے] مصنف نے ازراہِ انکسار اس کتاب کو اتاترک کی سوانح عمری قرار دیا ہے۔ لیکن اگر وہ اسے ''قصیدۂ نعتیہ در شانِ اتاترک علیہ السلام'' کے نام سے موسوم کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ کتاب پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ترکی میں ایک نبی مبعوث ہوا تھا...... یہ مبالغہ جس شخص کے حق میں کیا گیا ہے اسے مرے ہوئے ابھی کچھ بہت زیادہ دن بھی نہیں گزرے کہ ماضی کے دھندلکے سے فائدہ اُٹھا کر اسے دیوتا بنا ڈالا جائے۔ پرانے زمانے کے مچھر کو آج ہاتھی بنایا جا سکتا ہے، مگر ہم عصروں کی آنکھوں میں کہاں تک خاک جھونکیں گے ... [کتاب کے مصنف کے بقول، اتاترک] نے مذہب [اسلام] کی اصلی روح کو برقرار رکھتے ہوئے درویشوں اور مولویوں کی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مذہب اسلام میں دنیاوی ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیت ہے‘اس میں اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ درویشوں اور مولویوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔اسی خیال کے ماتحت ترکی کی سرزمین کو اتاترک نے ملاؤں کے وجود سے پاک کیا‘اور فی الحقیقت اتاترک کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مذہبی اصلاح کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی --- بے معنی الفاظ کا کتنا عجیب مجموعہ ہے۔ان لوگوں کے ”لچک دار اسلام“ کی کیا تعریف کی جائے‘[ان کے نزدیک] اس کم بخت میں اس غضب کی لچک موجود ہے کہ دنیاوی ”ترقیوں“ کی خاطر قرآن کا قانون منسوخ کردینے تک کی گنجائش اس میں نکل آتی ہے۔اور اس ”مذہب اسلام کی اصل روح“ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ملا اور درویش کو سامنے رکھ کر اس طرح ڈائنامائیٹ سے اڑائیے کہ قرآن و سنت بھی ساتھ ساتھ اڑ جائیں۔اس کے بعد جو کچھ بچ رہے اس کا نام ’خالص روحِ اسلام‘ ہے“۔
(ترجمان القرآن ‘مئی-جون ۱۹۴۰ء‘ص ۳۲۲-۳۲۷)

مولانا مودودیؒ مقصد سے لگن رکھنے والے ایک ایسے ادیب اور مفکر ہیں جنھیں اپنے مخاطبین کے دل میں پیغام اتارنے اور ان کی شخصیت کو بدلنے سے غرض ہے۔مگر وہ اس غرض کے لیے زور زبردستی کا ویسا رویہ اختیار نہیں کرتے‘جو عموماً سیاسی یا مذہبی عناصر کے طرزِتخاطب کی پہچان اور ان کا عیب ہوتا ہے۔

ادب نام ہے اثر انگیزی کا اور یہ اثر انگیزی مولانا کی تحریر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اگر ہم انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع کے دینی ادب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے علمانے تفسیر‘حدیث‘سیرت‘فقہ اور تاریخ پر بڑی گراں قدر کتب تصنیف کیں۔لیکن ان کے اسلوب کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق اس دنیا سے نہیں ہے‘جسے وہ مخاطب کر رہے ہیں۔بعض مستثنیات کے سوا ان کی زبان اتنی ادق اور محاورے اتنے بوجھل اور مثالیں ایسی ہوش ربا ہیں کہ آپ ان میں سے کچھ مواعظ کو تو محفل میں بیٹھ کر بآوازِ بلند پڑھ نہیں سکتے۔لیکن اُس زمانے میں دینی کتابوں کا کلچر یہی تھا۔تاریخ پر مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی کتاب بڑی عمدہ ہے‘لیکن اگر آپ جملے کی طوالت دیکھیں تو اندازہ نہیں ہوتا کہ کہاں جا کر ختم ہوگا۔یہی صورت دوسرے علما کی تحریروں کی ہے حتیٰ کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ تک کا طرزِتحریر اس روایت سے جان نہ چھڑا سکا۔اس فضا میں مولانا نے دینی موضوعات پر تحریر و نگارش کا اسلوب بدل کر رکھ دیا۔

صاف نظر آتا ہے کہ دینی ادب کی زبان اور اسلوبِ بیان پر مولانا مودودیؒ کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور بحیثیت مجموعی علمائے دین کی زبان و بیان اور ان کے اسلوبِ تحریر میں ایک واضح تغیر واقع ہوا ہے‘مثلاً تفسیر میں مولانا عبدالحقؒ کی تفسیر حقانی اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر ترجمان القرآن کا مطالعہ کیجیے‘اور پھر پیر کرم شاہ صاحبؒ کی ضیاء القرآن دیکھیے‘ان کے اسلوب میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔اس اسلوبِ نگارش اور اندازِ تحریر کو جس شخص نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے‘وہ سید مودودیؒ ہیں۔

بحیثیت ادیب مولانا کا یہ بڑا منفرد پہلو ہے‘جس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔اگر انصاف سے کوئی نقاد تحقیق و تجزیہ کرے تو وہ دو اور دو چار کی طرح دکھا سکتا ہے کہ کیا فرق واقع ہوا ہے۔

بحیثیت مفکر‘مصلح اور مدبر

ایک مفکر (thinker)‘مصلح (reformer) اور مدبّر (statesman) کی حیثیت سے مولانا مودودیؒ کی شخصیت کو زیرِ بحث لانا ایک اہم موضوع ہے۔

جب اسلامی فکریات کے وسیع ذخیرے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی اسلامی فکر پر سب سے زیادہ جس شخص نے نہایت گہرے اثرات مرتب کیے‘وہ مولانا مودودیؒ ہیں۔ان کی اثر پذیری کا دائرہ اپنی وسعت اور عمق کے اعتبار سے‘اور اپنی اصابت فکر اور اپنے اثرات کے اعتبار سے منفرد مقام کا حامل ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بلاشبہہ دوسرے مفکرین اور خادمانِ دین نے بھی بیسویں صدی میں اسلامی فکر کو مالا مال (enrich) کرنے کے لیے بڑی خدمت انجام دی ہے' اور ان کی حیثیت کہکشاں کے روشن ستاروں کی سی ہے اور اس میں ان کے ہاں ایک دوسرے سے اثر پذیری بھی نظر آتی ہے۔ تاہم میری نگاہ میں مولانا مودودیؒ کو جس بنا پر منفرد مقام حاصل ہے' وہ یہ ہے کہ انھوں نے وہی کام کیا جو دوسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک اس وقت کے حالات کی روشنی میں اسلامی فکریات کے قائدین نے انجام دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو' میرا مضمون ''دینی ادب'' مشمولہ: تاریخ ادبیات پاک و ہند' ج ۱۰' ص ۲۶۱-۲۷۶' پنجاب یونی ورسٹی' لاہور)

اس کی ایک مثال اسلام کے لیے 'تحریک' کے لفظ کا استعمال ہے' جو بیسویں صدی میں اسلامی احیا کی علامت اور پہچان بن گیا۔ اس اصطلاح کی کچھ وہی حیثیت ہے جو دوسری صدی اور اس کے بعد کے زمانے میں 'شریعت' کی اصطلاح سارے دینی لٹریچر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ قرآن پاک میں لفظ 'شریعت' راستے اور طریقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ ہماری فکری تاریخ میں لفظ 'شریعت' دوسری صدی میں داخل ہوتا ہے' جب اس بات کی ضرورت تھی کہ اسلام کے پھیلاؤ اور نئے تہذیبی مسائل میں اسلام کی اُبھرتی ہوئی قوت کو پیش آمدہ مسائل کا کیسے جواب دینا ہے؟ اسلامی دعوت' اسلامی حکومت' اسلامی سوسائٹی' اسلامی اداروں کو کس طرح اپنا کردار ادا کرنا ہے؟ سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ قرآن اور سنت کی روشنی میں اسلامی نظام زندگی کیسے پیش کیا جائے؟ اصول فقہ اور فقہ دونوں کی نشوونما' ترقی اور ارتقا دراصل اس ضرورت کو پورا کرنے کی بروقت' مؤثر اور کامیاب کوشش تھی۔ اس عظیم کارنامے نے اگلے ۱۲۰۰ برسوں میں اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت اور خود دین اسلام' اور اسلام کے سیاسی نظام کو ایک ایسا بنیادی ڈھانچا عطا کیا' جس سے وہ ہر طوفانی تھپیڑے اور ہر سیاسی نشیب و فراز کا مقابلہ کر سکا اور اس کے ذریعے وہ ہر دور میں مسلمانوں کو اسلام سے وابستہ کر سکا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ شریعت بحیثیت اصطلاح' اسلام کے فکری اثاثے میں شامل ہوئی۔

فقہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض عبادات پر مشتمل نہیں ہے' بلاشبہہ عبادات اس کا اولین موضوع ہیں' پھر خاندان اور عائلی زندگی وغیرہ کے معاملات۔ یہ دونوں موضوعات فقہی کتب کے تقریباً دو تہائی حصے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فقہ میں مالی معاملات' معاشی احکام' تجارتی احکام' پھر قانون صلح و جنگ' معاہدات' سزائیں' تعزیر' حد اور سیر کے ابواب ہیں۔ سیر (قانون بین الاقوام) کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے ممالک سے کس طرح معاملہ کریں اور غیر مسلموں کے حقوق کی کیا صورت ہے؟ یہ تمام ابواب فقہ کے ہیں اور فقہ کا یہ نشوونما اور شریعت کا یہ وسیع تر نظام' دراصل قرآن و سنت کی دعوت کا فطری مظہر تھا۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جو دعوت پیش کی گئی تھی' جس نے ایک سوسائٹی' ایک تحریک' ایک ریاست اور ایک تاریخی رو کو پروان چڑھایا تھا' اس چیلنج کو نظریاتی' اخلاقی' قانونی اور ادارتی سطح پر ایک ہیکل اساسی (infra-structure) کی ضرورت تھی۔ ان فقہا نے اسے دو اور دو چار کی طرح واضح کیا تاکہ آنے والے کل کے مراحل کو طے کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہت کے باوجود قانون بادشاہوں کی مرضی کے تابع نہیں تھا بلکہ شریعت کا قانون تھا۔ کم و بیش ہر بادشاہ شریعت کے قانون اور قاضی کے حکم کے تابع تھا۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب تحریک ایک حقیقت تھی تو اس کے ماحصل کو محفوظ و مستحکم کرنے کے لیے فقہ اور شریعت کی تدوین کی ضرورت تھی اور اس تاریخی عمل نے شریعت کی مرکزیت کو برگ و بار عطا کیے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

پہلی اور دوسری صدی میں درپیش حالات کی طرح کا چیلنج اُمت مسلمہ کو دوبارہ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے شروع میں بڑی شدت کے ساتھ پیش آیا‘ لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ تب فقہ تو موجود تھی لیکن وہ نظام باقی نہیں رہا جس کو چلانے کے لیے وہ فقہ مدون کی گئی تھی۔ شریعت کا وہ ڈھانچا تو موجود تھا لیکن شریعت کہیں بھی قانون ارضی (law of land) کے طور پر موجود نہیں تھی۔ مغربی سامراج نے مسلم ممالک پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ممالک پر ہی نہیں بلکہ ذہنوں پر بھی‘ سیاسی نظام پر بھی‘ عدالتی نظام پر بھی‘ اجتماعی نظام پر بھی‘ معاشی نظام پر بھی‘ تعلیم پر بھی‘ حتیٰ کہ خاندان اور فرد پر بھی اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس منظرنامے میں یہ ایک ادھوری بات تھی کہ بس ”خلافت بحال کردو“۔ جو شخص بھی اسلام کے مزاج کو سمجھتا تھا اور وقت کے بحران اور اس کی اصلاح کا صحیح نقشۂ کار اس کے سامنے واضح تھا‘ اسے یہ بات بڑی سطحی اور غیر فطری لگتی تھی۔ ہم یہ دیکھتے ہیں اس موقع پر اُمت کے لیے ایک نقشۂ کار اور ایک واضح حکمتِ عملی متعین کرنے کا جو کام مولانا مودودیؒ نے کیا‘ وہ کم و بیش اسی نوعیت کا ہے جو دوسری صدی میں ہوا۔ تب ہم ایک نئی اصطلاح سے روشناس ہوئے اور وہ ہے لفظ ’تحریک‘۔

جس طرح اولین دور میں لفظ ’شریعت‘ نہیں تھا لیکن اسلام کے منشا کو بیان کرنے کے لیے ’شریعت‘ کا جامع لفظ آیا۔ آج اگر کوئی سوال کرے کہ اسلام کیا ہے؟ تو اس کا فوراً جواب ملے گا ”شریعتِ اسلامی“۔ گویا ’شریعت‘ اسلام کے نظام کار کی مجسم کی صورت میں اس زمانے میں آئی‘ جب اسلام ایک غالب اور ایک تاریخ ساز قوت تھا۔ وہ قوت‘ اپنی اخلاقی اور تہذیبی برکت کے ساتھ دنیا کے شمال‘ جنوب‘ مشرق اور مغرب میں کارفرما نظر آ رہی تھی۔ اس زمانے میں اس کی حرکت کے پہلو کو یوں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن جب حرکت اور پھیلاؤ کا وہ سلسلہ منقطع ہوگیا‘ اور اُمت جمود ہی کا شکار نہیں ہوئی‘ بلکہ اس کے ایک دوسری تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی نوبت آ گئی‘ تو نئی ضرورتیں اُبھریں۔ اب اسلام صرف اقتدار ہی سے محروم نہ تھا‘ بلکہ وہ ادارے جو اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرت اور ریاست کے ستون تھے اور اس کی پوری عمارت کو تھامے ہوئے تھے‘ ایک ایک کرکے منہدم ہوگئے‘ اور ان کی جگہ ایک دوسری تہذیب سے درآمد شدہ اداروں کو مسلمانوں کی سرزمین پر مسلط کر دیا گیا تو ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہوگئی۔ اب شریعت کو دوبارہ زندگی کی رہنما قوت بنانے کے لیے ایک نئے وژن اور نئی اجتماعی تحریک اور نئی قیادت کی ضرورت تھی۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ اسلام کا صحیح وژن‘ ایمانی دانش اور متوازن بصیرت کے ساتھ بیان کیا جائے‘ اس بصیرت کی وسعتیں اس کے اہداف کے ساتھ آشکارا کی جائیں‘ اس کو بروے کار لانے کے لیے قوت عمل‘ اس کے نظامِ کار کی منہج اور اس کے لوازمات کی فکر کی جائے۔ اور پھر عملاً وہ جدوجہد برپا کی جائے جو دین کی اقامت کا ذریعہ بن سکے۔

یہی وہ چیز تھی جس کے اظہار کے لیے مولانا مودودیؒ نے دین و دعوت اور نظام زندگی اور قانونِ حیات کے تصورات کو ایک مربوط شکل میں پیش کیا۔ انھوں نے قوی دلائل کے ساتھ اسلام کا جو انقلابی تصور پیش کیا وہ ’تحریک‘ کے لفظ میں ڈھل گیا۔ ان کے فکر کا اصل آہنگ یہ پیغام ہے کہ: اسلام ایک دین‘ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو عقیدے اور عبادت کے ساتھ ساتھ قانون‘ ثقافت‘ طرزِ معاشرت‘ معیشت‘ سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کو ایک منطقی ربط کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اسلام محض ایک نظری فلسفہ نہیں‘ بلکہ عقیدہ‘ اخلاق‘ قانون‘ معاشرت‘ تہذیب و تمدن اور اقدارِ حیات کا ایک ایسا امتزاج ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا صورت گر بھی ہے اور اس طرح وہ ایک تاریخی قوت ہے‘ جس کے داخلی وجود میں یہ صلاحیت کار ہے کہ وہ اپنے کو نافذ کرنے کے لیے لوگوں کو ترغیب دے‘ انھیں متحرک اور منظم کرکے ایک جدوجہد کا موج در موج حصہ بنا دے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

دوسرے یہ کہ اسلام‘ دین کے ساتھ ساتھ‘ ایک پیغام‘ ایک دعوت‘ ایک تبدیلی کا عمل ہے۔ جب دین کی ان تینوں جہتوں کے ساتھ‘ عقیدہ‘ عبادت‘ نظام زندگی اور قانون اور معاشرت اور پھر پیغام‘ دعوت‘ جدوجہد اور نفاذ کی منظم کوشش کی جائے تو سب مل کر اسلام کی حقیقی منشا بن جاتی ہے‘ جسے ’تحریک‘ کی اصطلاح سے سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے۔

بعض علما نے مولانا مودودیؒ کی اس پکار کو ’بدعت‘ قرار دے کر ناگواری کا اظہار کیا‘ کچھ نے بالکل ہی مسترد کر دیا‘ مگر ان افراد کے نامناسب ردعمل نے بہت جلد اپنی اپیل کھو دی۔ آج اُن پیشواؤں کے ارادت مند بھی انھی اصطلاحوں میں بات کرتے ہیں‘ جنھیں وہ کل مذموم قرار دے کر مولانا مودودیؒ کے خلاف فتووں کی بارش کر رہے تھے۔ گویا وقت اور حالات کی مناسبت سے مولانا مودودیؒ نے اسلام کے اصل پیغام کو اس کے جوہر سے جوڑنے‘ بیان کرنے اور دل و دماغ اور قول و عمل میں انقلاب برپا کر کے اس کو ایک زندہ تحریک بنانے کا کام کیا۔ مولانا مودودیؒ اور اس دور میں احیائی فکر کے علم بردار مفکرین کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی میں وہی کام کیا جو دوسری صدی ہجری میں اس وقت اُمت کے قائدین نے انجام دیا تھا۔ اس وقت ایک چلتے ہوئے نظام کو مستحکم کرنے اور انحراف کی یورش کے مقابلے کے لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ضابطے اور قانون کا پابند کرنا اصل ضرورت تھی‘ اور اب قانون اور ضابطے کا ایک مثالیہ تو موجود تھا مگر وہ قوتِ قاہرہ مفقود تھی‘ کہ جس کے ذریعے نظریات نظامِ حیات بن جاتے ہیں۔

اب اگر آپ اس کی تہ میں جانا چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ خلافت و اسلامی ریاست دراصل اس تحریک‘ اس جدوجہد اور تبدیلی کا نتیجہ ہوگی۔ اس کے لیے فکر کی تبدیلی‘ فکر کے ساتھ کردار کی تبدیلی اور کردار کے ذریعے معاشرے کی تشکیلِ نو کرنا ہوگی۔ اس مقصد کے لیے منظم جدوجہد کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں‘ جو بالآخر اسلامی معاشرے‘ اسلامی تہذیب و ثقافت‘ اسلامی حکومت‘ اسلامی ریاست اور حکومت الٰہیہ کے قیام پر منتج ہوگی۔ دیکھیے کہ خلافت کی اصطلاح جس نے ۱۹۲۴ء میں ایک خاص انداز میں پوری اُمت کو صدمے سے دوچار کیا تھا‘ اس کے زیادہ جان دار متبادل کے طور پر حکومت الٰہیہ‘ اقامت دین‘ اسلامی نظام کے قیام کی تڑپ اور پیاس اپنے نئے روپ اور نئے وژن کے ساتھ کس طرح اس مقام تک آ پہنچی ہے۔

علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ کے سامنے دراصل یہ بنیادی ایشو تھا۔ علامہ نے اپنے انداز و اسلوب اور اپنے دائرے میں اور اشاروں میں اور مولانا مودودیؒ نے تفصیل‘ وضاحت اور تسلسل کے ساتھ اس کا جواب دیا۔ مولانا مودودیؒ کی نگاہ میں اصل مسئلہ خلافت کے کسی روایتی ادارے یا symbol کا قائم ہو جانا نہیں‘ بلکہ خلافت تو اس وژن اور اس نئے عمل اور اس تہذیب کی سرتاج ہے‘ جس کے لیے ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی ہے‘ یعنی استخلاف فی الارض کی ذمے داری کو پورے شعور کے ساتھ ادا کرنا۔

آج کے دور اور حالات میں خلافت اور اقامت دین کے لیے مطلوب بنیادوں اور لائحہ عمل کے جو خدوخال سید مودودیؒ نے پیش کیے ہیں‘ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز فکر اور فکر میں بھی اسلامی فکر کی تشکیل جدید‘ وقت کی غالب فکر پر گرفت‘ تنقید و تصحیح اور ایک نئے انسان کو تیار کرنا ہے۔ ایسا انسان جس کا وژن‘ اخلاق‘ کردار‘ صلاحیت کار‘ تعلیم‘ وسائل اور اوقات کار کے نئے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس کے بعد دوسری چیز ایک منظم اور اجتماعی جدوجہد ہے۔ چونکہ یہ کام محض انفرادی طور پر انجام نہیں پا سکتا‘ اس کے لیے ایک منظم اجتماعی جدوجہد ضروری ہے۔ ایسے تمام اچھے انسانوں کو منظم کر کے اجتماعی جدوجہد میں لگا دینا‘ تاکہ اسلام وقت کی غالب قوت بن کر انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا سکے۔ اس مطلوبہ قوت کا جو وژن سامنے آتا ہے وہ ہے تبدیل شدہ انسان اور اس کے ذریعے ایک اچھے معاشرے کا قیام۔ اس کے ادارات میں تعلیم‘ معاشرت‘ معیشت شامل ہے اور جس کا موثر ترین پہلو انقلاب قیادت اور اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ صرف ایک خطے میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اسلام کو ایک کارفرما اور قائد کی حیثیت سے سامنے لانا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

سید مودودی کے علمی کارنامے کا احاطہ اور جائزہ وقت کی اہم ضرورت ہے' مگر اس جائزے کے تقاضوں کو ما حقہ پورا کرنا بڑا مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ بہر حال مندرجہ بالامعروضات کی روشنی میں کسی قدر غور وفکر اور مزید تحقیق وتحلیل (analysis) کے طور پر چند نکات مرتب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

سید مودودیؒ کے علمی کارنامے کی صحیح تفہیم کے لیے دو بنیادی باتوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے: اول یہ کہ ہماری تاریخ کی پہلی پانچ صدیاں اسلامی فکر کی تشکیل وتعمیر اور اسلامی تہذیب وتمدن کی صورت گری اور استحکام اور ترقی کے باب میں اسلام کی اجتہادی اور انقلابی قوت کا ایک ایسا ماڈل پیش کرتی ہیں جو اسلام کے مزاج اور تاریخی کردار کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم عرض کریں گے کہ دورِ رسالت مآبؐ اور دورِ خلافت راشدہ نہ صرف اسلام کے معیاری ادوار ہیں' بلکہ ہمیشہ کے لیے اسلامی مثالیے کے خدوخال متعین کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کے ساڑھے چار سو سال کے سیاسی نشیب وفراز سے اگر صرفِ نظر بھی کرلیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ دور علوم اسلامی کی تدوین کا زریں زمانہ ہے۔ تفسیر' حدیث' اصولِ فقہ' کلام' فلسفہ' تصوف' ان سب کے لیے یہ تعمیری اور تشکیلی دور ہے۔ اور امام غزالیؒ کی ذات اور کام میں اس دور کا حاصل دیکھا جا سکتا ہے۔

امام غزالیؒ نے فقہ' کلام اور تصوف کے تینوں دھاروں کو اپنے وقت کے فکری اور تہذیبی چیلنجوں کی روشنی میں اپنی مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ ایک نامیاتی اکائی (organic whole) میں مرتب اور منضبط کرنے کی بڑی راہ کشا اور کامیاب کوشش کی۔ پھر ایسی ہی ایک کوشش بارھویں صدی میں شاہ ولی اللہ مرحوم و مغفور کے کام میں نظر آتی ہے۔

سید مودودیؒ کے کام کو بیسویں صدی کے فکری اور تہذیبی چیلنج کے پس منظر ہی میں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ فکری اعتبار سے ان کا کام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے کام کا تسلسل اور اس علمی روایت کے بیسویں صدی میں احیا کی ایک شان دار مثال ہے۔

دوسری چیز وہ فکری اور تہذیبی ماحول ہے جس میں سید مودودیؒ نے یہ کام انجام دیا۔ اس میں مسلمانوں کا ۲۰۰ سال کا فکری جمود' مغرب میں نشاۃ ثانیہ (renaissance)' روشن خیالی (enlightenment) اور لبرل اور اشتراکی تحریکوں کا فروغ' صنعتی انقلاب' مغربی استعماری اور سرمایہ دارانہ قوتوں کا عالمی کردار پوری دنیا بشمول مسلم دنیا پر ان تسلط تھا۔ اس پس منظر میں شروع شروع میں مسلمانوں میں دو رجحان رونما ہوئے۔ ایک تحفظ اور اپنی میراث کو بچانے کے لیے قدامت پسندی اور جدید سے عدم تعاون اور اجتناب کا رویہ تھا' اور دوسری جانب اپنے تشخص اور روایت سے بے نیاز ہو کر غالب قوت سے ہم آہنگی اور ہم رنگی اختیار کرنے اور لبرلزم اور ماڈرنزم کے نام پر عملاً مغربی تہذیب' طرز فکر وعمل' سیاسی اور ثقافتی اداروں سے نئی ٹکنالوجی اور طرز معیشت کو بلاتفریق وامتیاز (indiscriminately) اختیار کرنے کا۔

روایتی مذہبی طبقات پہلے راستے میں نجات دیکھ رہے تھے' اور جدید تعلیم یافتہ اور مراعات حاصل کرنے والے طبقات دوسرے کو ترقی کا زینہ قرار دے رہے تھے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک وسیع خلیج تھی جسے پُر کرنے کے لیے کئی موثر کوششیں ہوئیں' جن میں سب سے اہم اسلام اور مسلم تہذیب وتاریخ پر مسلمانوں کے اعتماد کو بحال کرنے کی وہ کاوش تھی' جو سید امیر علی' شبلی نعمانی اور ندوۃ العلما اور دارالمصنفین نے انجام دی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس پس منظر کے ساتھ برعظیم پاک و ہند میں دو آوازیں اُبھریں جو اپنی تازگی، وسعت اور انفرادیت (originality) کے اعتبار سے بظاہر اپنے ماحول میں اجنبی، لیکن دراصل اسلام کے پہلے ۵۰۰ سال کی روایت کے احیا کی نقیب تھیں---ایک اقبال اور دوسرے ابوالکلام آزاد۔ اپنے اپنے انداز میں دونوں نے اسلام کی راہِ وسط کو اجاگر کیا اور قدیم اور جدید کے درمیان راہِ صواب کی نشان دہی کی۔ لیکن صرف اس حد تک کہ جمود پر ضرب لگائی، مغربیت کے طلسم کو چیلنج کیا اور اسلام کے حقیقی پیغام اور مشن کی طرف مراجعت کی دعوت دی---جس شخص نے اس نقشے میں رنگ بھرا اور اس دعوت کو فکروعمل دونوں میدانوں میں ایک حقیقی اور موثر تحریک بنانے کے لیے شب و روز وقف کر دیے، وہ سید مودودیؒ ہیں۔ جنھوں نے یہ کام روایت سے بغاوت کے ذریعے نہیں بلکہ روایت کو تجدید کے عمل کا حصہ بنا کر، اور جدید کو نظرانداز کر کے نہیں، بلکہ جدید کو اپنی تہذیبی اقدار کی کسوٹی پر پرکھ کر اور خذما صفا ودع ما کدر (جو درست ہے اس کو قبول کر لو اور جو نادرست ہے اس کو رد کر دو) کے اصول کے مطابق انجام دیا۔ ان کے اس کام کے تین اہم پہلو ہیں:

۱- فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو

۲- اُمت کی کمزوری اور زوال کے اسباب کی تعین و تشخیص اور اصلاحِ احوال کے خطوطِ کار کی نشان دہی۔

۳- اصلاح کے نقشے کے مطابق تبدیلی اور تعمیرِ نو کی جدوجہد کا عملی آغاز

یہی وہ تین کام ہیں جس کے باعث بیسویں صدی کی تاریخ میں سید مودودیؒ ایک مفکر، ایک مصلح اور ایک مدبر کی حیثیت سے بڑا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں اپنی تصنیفی زندگی کے ۶۰ برسوں میں سید مودودیؒ نے تقریباً ڈیڑھ سو کتب کی تصنیف و تالیف کے ذریعے خدمت انجام دی۔ انھوں نے تفسیر قرآن، تشریح احادیث، تعلیم فقہ کے ساتھ اجتہادی بصیرت سے دورِ حاضر کے جملہ اہم علوم اور مسائل کے بارے میں اسلامی فکر کے اساسی اصول پیش کیے۔ ان کے اجتہادی کام کا دائرہ چند گنے چنے مسائل تک محدود نہیں ہے، بلکہ اصل ماخذ اور تاریخی روایت کے ساتھ، پوری فکرِ اسلامی کی روشنی اور تسلسل میں تعمیر اور تشکیلِ نو ہے۔ مولانا مودودیؒ کے اس کام کی انفرادیت، وسعت اور گہرائی پر برسوں نہیں صدیوں تحقیق ہو گی اور اس سے آنے والی نسلیں روشنی حاصل کریں گی۔

اس سلسلے میں سید مودودیؒ کا سب سے بنیادی کام عقیدے کی تشریح اور توضیح ہے۔ سید صاحبؒ کی فکر کو سمجھنے کے لیے سب سے کلیدی تصور توحید کے عقیدے کی تشریح اور اس کے تقاضوں کی تعلیم ہے۔ قرآن نے الٰہ اور رب کا جو تصور پیش کیا ہے، اس دور میں اس کی واضح ترین تعلیم سید مودودیؒ کا سب سے بڑا فکری کارنامہ ہے۔ توحید کے تصور کو شرک کی تمام آلایشوں سے پاک کرنا اور اللہ کو الٰہ ماننے کے مضمرات کو جس طرح سید مودودیؒ نے بیان کیا ہے، وہ اظہار مدعا کی دنیا میں ایک انقلابی کارنامہ ہے۔ اللہ صرف خالق اور پالنہار ہی نہیں ہے، بلکہ وہ حاکم، آقا، مطاع اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ ایمان کے معنی ایک طرف اپنے پیدا کرنے والے کو پہچاننا اور اس کے دامن میں پناہ لینا ہے تو دوسری طرف اس سے عہدِ اطاعت کرنا ہے کہ پھر زندگی کے ہر شعبے میں اس کی رضا کا حصول، اس کے احکام اور ہدایت کی اطاعت اپنے آپ کو اور اپنے پورے معاشرے کو صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگ لینا ہی کمال ترقی و کامیابی ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ تصور ایک طرف روایتی مذہبی جمود کو پارہ پارہ کر دیتا ہے تو دوسری طرف زندگی کو خانوں میں تقسیم کرنے اور الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو کر محض عقل، تاریخ اور تجربے کے سہارے زندگی گزارنے والے تمام طریقوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ عبادت صرف مخصوص اسلامی مظاہر (rituals) کا نام نہیں، بلکہ پوری زندگی کو منصوص عبادات کی ادائیگی اور ان کی رمزیت اور اثر انگیزی کی قوت سے اللہ کی بندگی میں دینے اور اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اور اسلام ہے ہی وہ دین جو ایک طرف انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے تو دوسری طرف انسان کو خالق کائنات کی مرضی سے ہم آہنگ (harmonize) کرنے کا وہ طریقہ ہے جس پر پوری کائنات عامل ہے۔ پوری کائنات اللہ کی مسلم ہے کہ اس کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق عمل پیرا ہے۔ جب انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہو کر اللہ کے قانون کی اپنے ارادے سے پابندی کرتا ہے تو وہ پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے اسے حقیقی امن و سلامتی حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے رب، اپنی ذات اور فطرت، اور پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگی اور اطمینان کا رشتہ استوار کر لیتا ہے۔ اسلام کے معنی یہی سپردگی ہے جو اطمینان، امن اور سلامتی پر منتج ہوتی ہے (اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○ الرعد ۱۳:۲۸)۔

توحید کے اس تصور کی وضاحت کے بعد سید مودودیؒ اسی توحید کی بنیاد پر پوری انسانی فکر اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے اسلامی تعلیمات کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ قرآن و سنت اور اسوۂ رسولؐ سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ہی مکمل دین ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے کافی و شافی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام کے نظامِ حیات کے ہر ایک پہلو کو انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا وہ کیا نقشۂ کار ہے جو قرآن و سنت کی تعلیمات کی بنیاد پر ظہور پذیر ہوتا ہے، اور ایک متوازن فکرِ انسانی اور علومِ عمرانی کی تشکیلِ نو کس طرح ان بنیادوں کے اوپر انجام دی جا سکتی ہے۔ قانون، سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم، حقوقِ انسانی، عالمی نظام، غرض ہر پہلو پر انھوں نے اخلاقی دیانت، اجتہادی بصیرت اور عمیق تحقیق کے ساتھ اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کی خدمت انجام دی ہے۔ فردِ واحد نے وہ کام کر دکھایا، جو بڑے بڑے ادارے اور محققین کی بڑی بڑی جماعتیں بھی بمشکل انجام دے پاتی ہیں۔

سید مودودیؒ نے تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کی کش مکش کی تصویر کشی کے ذریعے انسانی زندگی کے اصل ایشوز کو مرتب کیا ہے اور بتایا ہے کہ آفرینش کے آغاز سے تاریخ دو ہی قوتوں کی پیکار کی آماجگاہ ہے، ایک اسلام ہے اور دوسری جاہلیت (یعنی اللہ سے بے نیاز ہو کر زندگی کا نقشہ بنانے کی کوشش خواہ اس کا نام اور رنگ کیسا ہی کیوں نہ ہو)۔ یہی وہ کش مکش ہے جس میں انسان کو استخلاف فی الارض کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، جو امتِ مسلمہ کا مشن، یعنی شہادتِ حق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور جس کے لیے نفس سے جنگ سے لے کر کارزارِ حیات میں شر، ظلم اور فساد کے خلاف جہاد ہی اللہ کے بندوں کی اصل ذمہ داری ہے۔ تزکیہ نفس سے لے کر قتال فی سبیل اللہ تک، یہ سب اس نقشۂ راہ کے مراحل ہیں۔ حق کے غلبے کی جدوجہد ہی ایمان کا اصل تقاضا اور ثمر ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

سید مودودیؒ نے اسلام کے اس وژن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جو کام کیا' اس کے تجزیے سے ان کے علم الکلام کے خدوخال مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام کے اولین دور میں وژن کی صحت اور جدوجہد کی قوت کا سرچشمہ قرآن سے براہِ راست رہنمائی اور سنت رسولؐ پر مضبوطی سے قائم رہنا تھا۔ بڑھتی ہوئی اسلامی قلمرو اور دنیا بھر میں مسلمانوں کے پھیل جانے سے جو نئے مسائل پیدا ہوئے تھے' ان کے حل کے لیے اسلامی فقہ کی تدوین' اجتہاد اور اجتہادی فیصلوں کی تنفیذ وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ فکر' تعلیم اور معاملات کا کچھ ایسا آہنگ بن گیا کہ فقہ اور روایت کو اولیت حاصل ہوگئی اور قرآن وسنت سے بلاواسطہ ربط و رہنمائی میں اضمحلال آگیا۔ جن نام نہاد مصلحین نے فقہ اور روایت سے بغاوت کی بات کی' وہ اسلام کی روح اور اس کے مشن سے ناواقف تھے۔ لیکن فقہ اور روایت سے رہنمائی اور تعلق کو منقطع کیے بغیر احیاے اسلام کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اور سنت سے رشتہ استوار کیا جائے اور نئے حالات میں رہنمائی کے لیے ترتیب وہی قائم کی جائے جو دورِ اول میں تھی--- یعنی قرآن' پھر سنت اور پھر اجتہاد۔ جس میں سلف کے اجتہاد اور اس کے نتیجے میں ظہور میں آنے والی فقہ سے اصولوں کے مطابق استفادہ ہے۔ پھر جس طرح اصولیین نے اپنے زمانے میں اپنے وقت کے علوم اور مسائل کو سامنے رکھ کر اسلام کی رہنمائی کو متعین کیا' اسی طرح آج کا ماحول اس پورے علمی اثاثے کو سامنے رکھ کر لیکن جدید علوم اور عصری مسائل کے حقیقی ادراک کے ساتھ غوروفکر اور اجتہاد و استنباط کے سلسلے کو آگے بڑھانا ہے۔ اس کے لیے سائنس' عمرانی علوم اور دورِ جدید کے اس 'عرف' کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے' جو مقاصد شریعت سے ہم آہنگ اور احکام اسلام سے متصادم نہ ہو۔

تحقیق' تجزیے' استنباط اور اطلاق کی یہ وہ حکمت عملی ہے جو سید مودودیؒ نے اختیار کی۔ اسی طرح ان کے علم الکلام میں دورِ جدید کے تقاضوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم وافکار کی تشکیل جدید ہی نہیں بلکہ فکرِ انسانی کی تشکیلِ نو کے اس عمل کو انجام دیا جانا چاہیے۔ اس کے خطوطِ کار کا تعین اور اس کے استعمال سے حاصل شدہ نتائج کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ گویا فکر اور فکری عمل کو آگے بڑھانے کے راستے اور طریقے بتا کر' ان دونوں میدانوں میں بھی سید مودودی نے نئے چراغ روشن کیے اور مستقبل میں کام کرنے والوں کے لیے تابندہ نقوشِ راہ چھوڑے۔ ان کے سارے کام کا ہدف اللہ سے بندوں کو اللہ سے قریب کرنا اور ان کے اندر اپنے رب سے مغفرت کی طلب بڑھانا تھا۔ لیکن فرد کی اصلاح' فکر کی تشکیلِ نو' وقت کے فتنوں اور چیلنجوں کا جواب' اسلامی زندگی' مسلم معاشرہ' اسلامی ریاست اور اسلام کے عالمی نظام کے خدوخال کی وضاحت کے ساتھ ان کی توجہ ایک اور کلیدی نکتے پر مرکوز رہی' اور وہ یہ کہ اچھے انسانوں کی تیاری کے ساتھ اجتماعی جدوجہد اور معاشرے کی تعمیر وتشکیل کے ذریعے انقلابِ قیادت کا معرکہ کیونکر سر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عملاً مربوط ومنظم جدوجہد کی کہ دین کے قیام' اسلامی معاشرے اور ریاست کے قیام اور ہر سطح پر قیادت کی تبدیلی اور فاسد قیادت سے زمامِ کار صالح قیادت کی طرف منتقل کر کے انسانیت کی قیادت اہلِ خیر کے ہاتھوں میں لائی جاسکے۔ سید مودودیؒ کی فکر کا مرکزی نکتہ توحید کے تصور کی وضاحت ہی نہیں ہے بلکہ توحید کے تصور کی بنیاد پر انسان سازی اور زمانہ سازی کا عمل ہے۔ یہ کام انھوں نے فکر کے میدان میں بھی انجام دیا اور پھر ایک مصلح کی حیثیت سے عملاً اس جدوجہد کو برپا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ مولانا مودودیؒ ایک دیدہ ور مفکر تھے' جن کے ہاں فکری ارتقا جاری رہا۔ وہ تحقیق اور دلیل کی بنیاد پر اپنی آرا پر نظرثانی کے لیے کھلا دل اور ضروری لچک رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر ابتدا میں پہلے تحدید ملکیت زمین کے بارے میں مولانا کا کم و بیش وہی نقطۂ نظر تھا' جس پر فقہا عامل تھے۔ تاہم' جماعت اسلامی کا منشور تیار کرنے کے مختلف مراحل (۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۰ء) میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر لامحدود ملکیت زمین ظلم اور انسانی سماج میں شدید عدم توازن کا باعث بن جائے تو زمین کی حد مقرر کی جاسکتی ہے۔ اس میں ناجائز ملکیتی زمینوں کو بحق سرکار ضبط کر کے ضرورت مند کاشت کاروں میں تقسیم کیا جانا چاہیے اور جائز ملکیتوں میں زرعی اور بارانی زمینوں کو ایک حد سے زیادہ کی صورت میں' ریاست خرید کر مستحق افراد کو دے سکتی ہے۔ ان کے ہاں یہ تحدید کمیونسٹوں کے قومیانے والے تصور سے بالکل مختلف اور عدل پر مبنی ہے۔

مولانا مودودی کے ہاں جمود نہیں ہے' وہ سوچ کر رائے قائم کرتے تھے لیکن اپنی رائے پر قفل نہیں لگاتے تھے۔ شوریٰ میں تو میں نے دیکھا کہ مولانا نے لوگوں کو گھنٹوں بحث کرنے کا موقع بھی دیا ہے اور اپنی آرا کو تبدیل بھی کیا ہے۔ ہم سب ان کے شاگردوں اور خوردوں میں سے ہیں لیکن وہ ہماری رائے کو بھی پوری توجہ سے سنتے تھے' نوٹس لیتے تھے' جواب میں دلیل دیتے تھے اور پھر قائل کرنے اور قائل ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ایسے بلند پایہ انسان کا ایسے کھلے انداز میں شورائی آداب پر عمل کرنا' حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ ہی کا حصہ تھا۔

زندگی کے نئے مسائل اور نئی اُلجھنوں پر جب بھی سوچنے کا مرحلہ آتا تو مولانا اس پر ازسرنو غور کرتے تھے۔ جس چیز کے ایک سے زیادہ حل ہو سکتے تھے' ان میں ترجیح قائم کرتے تھے۔ مجھے مرکزی شوریٰ میں دو دن تک جاری رہنے والی وہ بحث اچھی طرح یاد ہے جس میں جداگانہ انتخابات کے مسئلے پر بات ہوئی تھی۔ یہ بحث محض نظریاتی نہیں تھی' بلکہ یہ اخلاقی اور اصولی حوالے کے ساتھ ساتھ عملی سیاست کے گہرے ادراک پر مبنی تھی۔ اس پر شوریٰ میں دو آرا موجود تھیں۔ مولانا نے ایسے امور کو بڑی نزاکت سے نبھایا اور شوریٰ میں بالآخر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے (near consensus) کی کیفیت پیدا کی۔

میدانِ عمل میں رھنما خطوط کا تعین

مولانا مودودیؒ ایک مصلح کی حیثیت سے محض ایک نظریہ ساز (theorist) نہیں ہیں' بلکہ ایک عملی مصلح (active reformer) کی حیثیت سے ان کی نگاہیں ہمیشہ زمینی حقائق پر مرکوز رہتی ہیں۔ ایک ہمدرد معالج کے طور پر وہ مریض کو صحت یاب دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں اور مریض کی حالت کے مطابق نسخے میں ترمیم و تبدیلی بھی کرتے ہیں۔

عملیت پسند مولانا مودودیؒ میں خوداعتمادی تو بلا کی تھی' مگر خودپسندی کا کوئی شائبہ بھی ان کی زندگی میں نہ تھا۔ وہ نئے حالات میں' دین کی روشنی میں' نئے تجربات اور نئے راستے نکالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند اور پورے عالمِ اسلام کی اصلاح کا انھوں نے بیڑا اٹھایا' اور اس عملی جدوجہد میں اپنا صحیح کردار ادا کرنے اور قیادت کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ جتنا بڑا کارنامہ انھوں نے فکری حیثیت میں انجام دیا' اتنا ہی بڑا کارنامہ انھوں نے عملی سطح پر بھی انجام دیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس کے لیے انھوں نے ایک جماعت بنائی مگر جماعت اسلامی کا قیام بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دینے کے مترادف ثابت ہوا۔ جوں ہی انھوں نے جماعت بنا کر دعوتِ عام دی تو وہ لوگ بھی جو ان کو ترجمانِ اسلام کہتے تھے نہ صرف پیچھے ہٹ گئے' بلکہ ان کے ناقد بن گئے۔ مولانا نے نئے حالات میں اسلامی فکر کے احیا اور تشکیلِ نو تک اپنی مساعی کو محدود نہیں رکھا' بلکہ دنیا کو بدلنے کی' مسلمانوں کو بیدار کرنے کی' اُمت کو شہداء علی الناس کا کردار ادا کرنے' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری نبھانے اور اقامت دین کی ذمے داری اٹھانے کے لیے سرگرم کر دیا۔ ان کی ذات میں مفکر اور مصلح' داعی اور منتظم' قائد اور مدبر کی صلاحیتوں کا اجتماع تھا۔ یہی وہ پہلو ہے جو ان کے کردار کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔

● **جدید خطوط پر تنظیم سازی**: مولانا مودودیؒ نے اپنے عہد کی سرکردہ تنظیموں کے تنظیمی ڈھانچوں اور نظاموں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کو ایک انقلابی تحریک کی ضرورت ہے جو محض ایک سیاسی تنظیم نہ ہو۔ اس تناظر میں جماعت اسلامی کا وجود دراصل ایک نظریاتی تحریک کا روپ ہے۔ بنیادی پہلو یہ ہے کہ مولانا نے جماعت کے دستور میں پہلے ہی دن سے جو بنیادی چیز رکھی ہے وہ اس کا وژن ہے' جس میں لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا تصور' اور اس کے تقاضے جماعت اسلامی کا محور ہیں۔ جماعت کے دستور کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ اس میں پہلی بنیادی چیز اللہ کی حاکمیت' دین کی اقامت' حکومت الٰہیہ کا قیام اور زندگی کے پورے نظام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر ازسرِنو مرتب کرنے کا عزم اور سرگرم جدوجہد کا عہد ہے۔ اس میں دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ ہر انسان قابلِ احترام ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معیارِ حق نہیں۔ اصل کسوٹی اور معیار اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ باقی سب کو اسی میزان پر پرکھا جائے گا اور جو جتنا اس معیار سے قریب ہوگا' وہ اتنا ہی محترم ہوگا۔ جماعت کے قیام میں یہ اصول بھی کارفرما رہا کہ اس کی رکنیت بلاامتیاز تمام مسلمانوں کے لیے کھلی ہے۔ لیکن رکن وہ بنے گا جو شعوری طور پر اس ذمہ داری کو قبول کرے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا عہد کرے۔

مسلم تاریخ میں بیعت' امیر کے ہاتھ پر ہوتی تھی اور امیر کے مرجانے کے بعد دوسرے فرد سے بیعت ہوتی تھی۔ لیکن مولانا مودودیؒ نے نظامِ تنظیم کو بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے کہا: دعوت نہ تو امیر کی طرف ہے اور نہ بیعتِ امیر کی طرف' بلکہ دعوت بھی جماعت میں متعین کردہ نصب العین کی طرف ہے اور بیعت بھی جماعت کے ساتھ ہے' جسے حلفِ رکنیت کی شکل دی گئی۔ امیر پر نظام کو چلانے کی ذمہ داری ہے' وہ اس کی قیادت تو کرے گا' اور بحیثیت امیر' نظام جماعت کے تحت اس کی اطاعت فی المعروف بھی ضروری ہے' لیکن امیر بھی اسی طرح دستور کا پابند ہے جس طرح ایک رکن۔ اسی طرح اطاعت نظام امر کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دعوت امیر کی طرف نہیں' جماعت اور اس کے مشن کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کا نظام معروف میں اطاعت اور منکر میں احتساب سے عبارت ہے۔ یہ جماعت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ میرے علم کی حد تک مسلمانوں کی اجتماعیت کی تاریخ میں مولانا مودودیؒ نے پہلی مرتبہ تحریری دستور کے اندر احتساب کے حق کو حق ہی نہیں' ذمہ داری قرار دیا ہے۔ ہر رکن' شوریٰ اور پورا نظام امر' احتساب کے عمل میں شامل ہے۔ ہر رکن یہ عہد کرتا ہے کہ میں جہاں کہیں کوئی برائی دیکھوں گا' اس کی اصلاح کی کوشش کروں گا۔ مراد یہ ہے کہ رکنیت کے وجود میں احتساب کا حق ہی نہیں فرض بھی شامل ہے۔ دستور میں شوریٰ کے منصبی فرائض میں بھی احتساب شامل ہے۔ یہ اصول تو بڑی جمہوری پارٹیوں میں بھی نہیں ہے۔ پاکستان کی چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں اور مذہبی جماعتوں کے نظامِ کار کا جائزہ لیجیے' تو نظر آتا ہے کہ یا تو وراثت کا نظام کارفرما ہے' یا جس فرد کا وراثت' دولت اور اقتدار کے بل پر پارٹی پہ قبضہ ہے' وہی حرفِ اول ہے اور وہی حکمِ آخر۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس کے بعد ہے اختلاف رائے کا حق۔ مولانا مودودیؒ نے اسے بھی ایک دستوری حق قرار دیا ہے‘ یعنی آپ پالیسی سے اختلاف رکھ سکتے ہیں‘ عقیدے سے نہیں۔ امیر سے اختلاف رکھ کر بھی آپ جماعت کے رکن رہ سکتے ہیں اور ایک وقت کی طے شدہ پالیسی کو بدلنے کے لیے افہام و تفہیم اور معروف شورائی ذرائع سے کوشش کرسکتے ہیں۔ جماعت کے دستور میں بھی شورائی نظام کا ارتقا ہوا ہے‘ اور ایک تدریجی عمل سے گزر کر جماعت نے ایک طرف امیر کو قیادت اور رہنمائی کا اختیار دیا ہے تو دوسری طرف پالیسی کو شوریٰ کے فیصلے کا پابند کیا ہے‘ جب کہ آخری فیصلہ شوریٰ یا اجتماع ارکان کا استحقاق ہے۔ اس عمل سے شوریٰ کی برتری زیادہ مستحکم ہوئی ہے۔

● **نظام کی تبدیلی کا طریق کار اور حکمت عملی:** مولانا مودودیؒ نے ملکی نظام میں تبدیلی کا جو طریق کار پیش کیا ہے‘ وہ افکار کی تبدیلی‘ کردار کی تعمیر اور رائے عامہ کی ہمواری کے لیے جمہوری‘ قانونی اور دستوری طریقے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جماعت کے دستور میں اس طریق کار کو دوٹوک انداز میں پیش کیا گیا اور عملاً ملک کی سیاست میں دستوریت (constitutionalism) اور جمہوری ذرائع سے تبدیلی کی جدوجہد کی مثال قائم کی گئی۔ وہ سختی سے اس راستے پر کاربند رہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو بھی اس کی دعوت دی۔ انھوں نے کھلے الفاظ میں کہا: خفیہ جماعتوں کا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ عرب ممالک میں چونکہ یہ رجحان گڈمڈ تھا‘ اسی لیے عرب نوجوانوں سے مولانا مودودیؒ نے خطاب کرتے ہوئے یہی فرمایا کہ میں آپ کو تلقین کرتا ہوں کہ آپ ان طریقوں کو اختیار نہ کریں جو فساد فی الارض کا ذریعہ بنتے ہیں۔ البتہ مسلمان جہاں پر محکوم ہیں اور غیروں کی غلامی میں ہیں‘ اور ان کے لیے سیاسی جدوجہد کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ وہاں آزادی کے لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ وہ جہاد کی راہ اختیار کریں تو یہ ان کا حق ہے۔ لیکن جن معاشروں میں آزادی ہے اور تبدیلی کے کچھ بھی جمہوری ذرائع موجود ہیں‘ وہاں آئینی اور جمہوری طریقے سے تبدیلی لانا ہی مولانا کی نگاہ میں اور جماعت کے دستور کے تحت تبدیلی کا صحیح طریقہ ہے۔

یہاں ہمیں مولانا مودودیؒ مرحوم کی فکر کا یہ بڑا اہم نکتہ ملتا ہے‘ جسے علم السیاست میں ارتقائی عمل اور انقلابی عمل کہا جاتا ہے۔ مولانا نے بالکل ایک بیچ کا راستہ نکالا ہے‘ اور وہ یہ ہے کہ ان کے تمام مقاصد تو انقلابی (revolutionary) ہیں‘ لیکن ان کے حصول کے لیے طریقہ کار ارتقائی (evolutionary) ہے۔ اسلامی انقلاب ہمارا مطلوب ہے‘ لیکن اس انقلاب کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی مختصر راستہ (short cut) نہیں ہے اور نہ جبر کا کوئی طریقہ اس منزل کے حصول کے لیے مددومعاون ہوسکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ ذہنوں‘ معاشرے اور کردار کی تیاری کے ذریعے رائے عامہ کو قائل کرتے اور اس طرح قیادت کی تبدیلی کا راستہ بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: قیادت کی تبدیلی کا لازمی تقاضا یہی ہے۔ پہلے مولانا کا خیال تھا کہ اسلامی ریاست میں سیاسی پارٹیاں نہیں ہونی چاہییں۔ لیکن بعد میں انھوں نے محسوس کیا کہ اگر سیاسی پارٹیاں ان حدود کی پابندی کریں‘ جو شریعت نے اجتماعی زندگی کے لیے مرتب کی ہیں تو وہ اس ریاست کے نظام کار کو چلانے کے لیے نہ صرف معاون بلکہ ضروری ہیں۔ خاص طور پر سیاسی آزادی اور اختلاف رائے کو اداراتی اور منظم شکل دینے کے لیے اس کو قبول کیا۔ اسی طرح ایک خاص مقصد کے لیے ایک خاص طرز پر جماعت کو تبدیلی کا صورت گر بنایا۔ پھر انھوں نے جماعت کے ساتھ‘ معاشرے کے ہر طبقے کو فعال طور پر ساتھ لے کر چلنے کے لیے برادر تنظیموں کا ایک وسیع نظامِ کار وضع کیا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ایک اور مثال ہے' ان کا لیکچر: اسلام کا نظریۂ سیاسی' جو تقسیم ہند سے ۱۰ برس قبل شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے امیر کے لیے زندگی بھر مامور رہنے اور شوریٰ کے مقابلے میں حق استرداد کو خلافت راشدہ کے تعامل سے لیا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ مولانا کے ہاں ہمیں دیانت اور علمی توسّع کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنی بات کو ہمیشہ دلیل اور اعتماد سے پیش کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی افہام و تفہیم اور دلیل سے اپنی رائے بدلنے پر آمادہ رہے ہیں۔ ایسے ہر مشاہدے سے مولانا کی عظمت کا نقش گہرا ہوا ہے۔ جب اسلامی دستور کی تدوین کا مرحلہ آیا اور میں نے مولانا کی اسلامی قانون کی تدوین والی تقریر کو Islamic Law & Constitution میں شامل کر کے اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے کام شروع کیا تو اس موقع پر مولانا ظفر احمد انصاری' چودھری غلام محمد اور غلام حسین عباسی صاحب کے ہمراہ' مولانا مودودیؒ سے ان معاملات پر گفتگوئیں ہوئیں۔ مولانا بہت کھلے دل سے ہماری گزارشات پر غور فرمایا اور اس مکالمے کے نتیجے میں متعدد امور میں انھوں نے اپنی رائے میں ترمیم کی۔ مثال کے طور پر' امیر کے سلسلے میں مولانا نے رائے تبدیل کی اور کہا کہ دورِ امارت مقید ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خلفاے راشدینؓ تو تقویٰ' کردار اور اپنی خدمات کے اعتبار سے بہت اونچے مقام پر تھے' پھر وہ محض منتخب سربراہ ہی نہیں تھے بلکہ تحریک اسلامی کے ستون اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور افضل ترین حضرات تھے' اس لیے ان کے اوپر یہ بھروسا کیا جا سکتا تھا لیکن' اگر آج ایک آدمی اختیار اور اقتدار کے سرچشموں پر قابض ہو جاتا ہے تو سوال یہ ہے کہ اسے ہٹانے کا راستہ کیا ہوگا۔

اسی طرح امیر یا لیڈر کو بھی شوریٰ کی رائے کا پابند ہونا چاہیے۔ مولانا مودودیؒ کے ہاں اس میں بھی ایک ارتقا ہے' جس کا نقطۂ عروج تفہیم القرآن میں سورہ شوریٰ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (ص ۴۲:۳۸) پر تفسیری نوٹ ہے' جو پورے تفسیری لٹریچر میں منفرد شان کا حامل ہے۔ اس میں مولانا نے لکھا ہے:

"مشاورت اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے' اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے...... جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو' اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا' اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظرانداز کر دینا زیادتی ہے...... اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتمد علیہ نمایندوں کو شریک مشورہ کیا جائے...... جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو' ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو' اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی' کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جرأتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں...... اسلامی طرزِ زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریک مشورہ کیا جائے...... خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے...... ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کے چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے...... اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں' احتجاج کر سکیں' اور اصلاح نہ ہوتی دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے' اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر' اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے" (تفہیم القرآن' ج ۴' ص ۵۰۸-۵۰۹)۔ یہی چیز امیر اور لیڈر کے لیے ہے۔ اکثریت کی رائے کو قبول کرنا اور اجماع پسندیدہ امر ہے۔ یہ آثار اپنے ارتقا کے ساتھ ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

پھر جب تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں جماعت اسلامی کے دستور کی تشکیل نو ہوئی تو اس میں امیر کی مدت پانچ سال مقرر کر دی گئی۔ یہ وہی وقت ہے جب ہم نے دستور میں سربراہ حکومت کے لیے پانچ سال کی مدت تجویز کی تھی، جسے مولانا نے قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح جماعت کے پہلے دستور میں شوریٰ کا ادارہ موجود تھا، لیکن ان ارکان شوریٰ کو امیر ان افراد کی قابلیت، بصیرت، خدمات اور تقویٰ کی بنیاد پر نامزد کرتا تھا۔ اس کے بعد شوریٰ کو منتخب کرنے کا ضابطہ بنایا گیا۔ شوریٰ منتخب کرنے کے لیے بھی دو نوعیت کے حلقے بنائے گئے۔ ایک کل پاکستان سطح پر انتخاب رکھا گیا، جس میں پانچ افراد کا انتخاب تھا اور باقی تمام ارکان شوریٰ کو علاقائی حلقوں کی بنیاد پر منتخب کرنے کا ضابطہ مقرر کیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۵۷ء کے دستور جماعت میں کل پاکستان بنیاد پر انتخاب کی الگ سے شق ختم کر دی گئی اور تمام علاقوں سے منتخب ارکان کی شوریٰ مقرر کی گئی۔ پھر ۱۹۵۲ء کے دستور میں شوریٰ کے بارے میں یہ شق تھی کہ امیر اور شوریٰ اتفاق رائے سے کام کریں گے۔ لیکن اگر شوریٰ اور امیر میں نزاع ہو تو کچھ امور میں شوریٰ، امیر کی رائے مان لے گی خصوصیت سے جن کا تعلق نصوص کی تعبیر سے ہو، اور کچھ امور میں امیر، شوریٰ کی رائے کو فوقیت دے گا خصوصاً انتظامی معاملات کے بارے میں۔ لیکن جب معاملات میں شوریٰ امیر کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر معاملہ ارکان میں بھیجا جائے گا اور اگر ارکان جماعت، شوریٰ کی رائے کو مان لیں تو پھر امیر مستعفی ہو جائے گا، اور اگر ارکان امیر کی رائے کو مان لیں تو شوریٰ مستعفی ہو جائے گی۔ پھر ۱۹۵۷ء کے دستور جماعت میں یہ بات لائی گئی کہ امیر اور شوریٰ اتفاق رائے سے کام کریں گے لیکن اگر اختلاف ہو تو امیر کو یہ حق ہو گا کہ وہ ایک سیشن کے لیے فیصلے کو موخر کر دے، اور اگلے سیشن میں شوریٰ جو بھی فیصلہ کرے اسے امیر مان لے۔ یہاں بھی وہی مشاورت، افہام و تفہیم اور شوریٰ کی بالادستی کا ارتقا ہے۔

اسی طرح مولانا کی رائے تھی کہ عورتوں کی شوریٰ الگ ہونی چاہیے اور مردوں کی الگ۔ لیکن جب عملی مشکلات اور بعض مختلف فیہ امور پر افہام و تفہیم کے پہلو پر مولانا سے تبادلۂ خیال ہوا تو انھوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ عورتیں بھی شوریٰ کی ممبر بن سکتی ہیں۔ اسی طرح غیر مسلموں کے بارے میں مولانا کی پہلے رائے یہ تھی کہ انھیں انتظامی امور میں مشورے میں شریک ہونا چاہیے اور ان کی شوریٰ الگ بنائی جائے۔ لیکن جب مولانا سے اس سلسلے میں تفصیل سے گفتگو ہوئی تو اس میں مولانا نے غور و فکر کے لیے خاصا وقت لیا۔ بالآخر وہ خود اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی ہو اور کوئی قانون سازی اسلام کے خلاف نہ ہو، اور اسمبلی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو تو ایسی صورت میں غیر مسلم بھی پارلیمنٹ کے ممبر بن سکتے ہیں جہاں وہ سارے معاملات میں رائے دیں گے اور رائے دہی میں بھی شریک ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔

اُمت کو منزل مقصود پر پہنچانے کے لیے مولانا مودودیؒ نے وسعت اور کشادہ روی کا انقلابی، جمہوری اور شورائی راستہ دکھایا۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ پہلے ایک ملک میں تبدیلی آنی چاہیے، پھر وہی ملک دوسرے ممالک میں تبدیلی لانے کے لیے ماڈل بنے گا۔ ان کی دعوت کا اولین ہدف اپنا وطن ہے، لیکن روے سخن پوری دنیا کی طرف ہے۔ عربی اور انگریزی میں اہم تصانیف اور تحریروں کے تراجم کا کام مولانا نے جماعت کے قیام کے ساتھ ہی شروع کروا دیا تھا۔ جماعت کی رودادوں میں ایک لمبی فہرست ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی بات اور اپنی آواز دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں تک پہنچانے کے لیے کیا کوشش کی ہے گویا کہ پورا عالم (global reach) ابتدا ہی سے ان کے پیش نظر رہا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

● **تحریک اور تنظیم کا فرق:** ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے نتیجے میں بھارت اور پاکستان میں جماعت اسلامی الگ الگ ہوگئی۔ مولانا کی پیش کردہ دعوت قبول کرنے والے بعض اصحاب نے سری لنکا، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں بھی اپنے طور پر جماعت بنائی۔ پھر مشرقی پاکستان کے تسلسل میں بنگلہ دیش میں بھی جماعت قائم ہوئی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں ان چھے جماعتوں کے مابین کسی درجے میں بھی کوئی تنظیمی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے کہیں بھی جماعت اسلامی کو قائم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ۱۹۶۴ء میں جب ہم جیل میں تھے تو ہمیں جیل میں معلوم ہوا کہ برطانیہ کے کچھ مخلص مگر جذباتی نوجوانوں نے جماعت اسلامی کے نام سے کام شروع کر دیا ہے۔ تب ہم نے مولانا مودودیؒ کی ہدایت پر جیل ہی سے ان کو یہ ہدایت بھیجی کہ: ''آپ جماعت کے نام سے کام نہ کریں' بلکہ آپ کا جو نام وہاں پہلے سے تھا' اسی کے تحت کام کریں' اور مقامی قانون کے تحت کام کریں۔ نہ جماعت آپ کی ذمہ داری لے سکتی ہے اور نہ آپ کے لیے یہ مناسب ہے کہ آپ اس نام سے وہاں کام کریں''۔ یہی اصول مولانا کا رہا ہے۔

اس طرح تحریک و تنظیم کے مابین ایک فرق بھی ہمارے سامنے آیا کہ اسلامی انقلاب کے لیے تحریکات تو ساری دنیا میں برپا ہوں' لیکن تنظیم ہر جگہ وہاں کے حالات کے مطابق الگ' آزاد اور اپنے قول و فعل کے لیے خود جواب دہ ہو۔ دنیا بھر میں اسلام کے لیے کام کرنے والی تحریکیں گویا کہ وسیع تر عالمگیر اسلامی تحریک کا حصہ ہیں' لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ جماعت اسلامی پاکستان کے نظم کا اور قانونی اور دستوری تعلق (link) نہیں ہے۔ آج بھارت' کشمیر' سری لنکا اور بنگلہ دیش میں جماعت کے نام سے کام ہو رہا ہے' فکر کی یکسانیت بھی ہے' لیکن طریق کار' حالات' ضروریات' دستور اور قیادت ہر مقام نے اپنے طور پر متعارف کرائے ہیں۔ یہ مولانا کی عملیت پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

● **جماعتی تشخص اور اشتراکِ عمل:** اسلامی انقلاب اور اسلامی تبدیلی کے لیے عملی سطح پر اور میدانِ کار میں مولانا مودودیؒ کے ہاں ایک لچک' خود بینی اور وسعت پائی جاتی ہے' جس میں دوسرے ہم مقصد افراد اور عناصر سے تعاون کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان میں ۱۹۴۹ء میں سول لبرٹیز یونین کا قیام عمل میں آیا' تو اس میں کمیونسٹ پارٹی بھی شامل تھی۔ بعد ازاں متحدہ حزب اختلاف (COP)' پاکستان تحریک جمہوریت (PDM)' جمہوری مجلس عمل (DAC)' متحدہ جمہوری محاذ (UDF) اور پھر پاکستان قومی اتحاد (PNA) کا قیام ہے۔ اس عمل میں مولانا مودودیؒ نے اپنی جماعت کے تشخص کو محفوظ رکھتے ہوئے' مشترک نکات پر دوسرے سیاسی' مذہبی اور سماجی عناصر کو ساتھ ملا کر چلنے کی مثال پیش کی ہے۔

مولانا مودودیؒ ہی کی قیادت میں جماعت اسلامی نے اسلامی دستور کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ 'قرارداد مقاصد' کی منظوری (مارچ ۱۹۴۹ء) کے وقت بلاشبہہ مولانا مودودیؒ' سنٹرل جیل ملتان میں تھے' لیکن اگر مولانا نے اسلامی قانون کے موضوع پر پنجاب یونی ورسٹی لا کالج' میں تقریر نہ کی ہوتی' اور وہ چار نکاتی پروگرام پوری قوم کے سامنے پیش نہ کیا ہوتا تو قرارداد مقاصد کبھی پاس نہ ہوتی۔ یہ مولانا کی فکر' وژن اور جدوجہد تھی' جسے قبولیتِ عام حاصل ہوئی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم' مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم اور چودھری غلام محمد مرحوم کی کوشش سے 'قرارداد مقاصد' کا جو مسودہ پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا' یہ مسودہ اسمبلی میں پاس ہونے سے قبل ملتان جیل میں مولانا مودودیؒ کو دکھایا گیا اور ان کی رضامندی کے بعد ہی وہ اسمبلی کے فلور پر پیش اور پھر منظور ہوا تھا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

۱۹۵۱ء میں علما کے ۲۲ نکات کی منظوری کے تاریخی لمحات کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اس وقت میں اسلامی جمعیت طلبہ میں تھا۔ اس سلسلے میں علما کی جو نشست ہو رہی تھی، اس میں راجہ بھائی [ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری]، خرم بھائی اور میں ان بزرگوں کے خادم کی حیثیت سے شریک تھے۔ جب پہلا اجلاس ہوا تو اس میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ مگر کسی کے سامنے یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہم نتیجے پر کیسے پہنچ پائیں گے۔ ان دھواں دھار تقاریر کے آخر میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے تجویز دیتے ہوئے کہا کہ: ''اس طرح کی تقریروں میں تو ہم کئی دن صرف کر دیں گے اور کچھ نتیجہ نہیں نکل سکے گا۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اس اجلاس کو موخر کر دیتے ہیں۔ اجلاس کے شرکا میں سے ہر شخص تحریر کر دے کہ اسلامی ریاست کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہییں۔ اس کے بعد ایک کمیٹی بنا دی جائے جس کے سربراہ مولانا سید سلیمان ندویؒ ہوں، ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے میں ان تجاویز کی روشنی میں ایک مسودہ تیار کر لیتا ہوں، اور پھر اس مسودے پر بحث کر کے کسی متفقہ لائحہ عمل کو منظور کر لیں گے''۔ سب نے اس تجویز کو بڑا پسند کیا۔

ہر ایک عالم دین کو سادہ کاغذ دے دیے گئے، بیش تر نے لکھا۔ سب سے طویل مضمون مولانا راغب احسن مرحوم نے لکھا، لیکن وہ مضمون لفاظی اور جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ ان سب کے برعکس مولانا مودودیؒ نے پنسل سے فل اسکیپ کا ڈیڑھ صفحہ لکھا، جس میں انھوں نے منطقی ربط کے ساتھ بڑے اختصار اور جامعیت سے بھرپور نکات بنا کر دیے کہ یہ اور یہ چیزیں ہونی چاہییں۔ چنانچہ علما کے ۲۲ نکات کی بنیاد وہی مسودہ بنا، تاہم آخری مسودہ مولانا ظفر احمد انصاریؒ نے اپنے قلم سے لکھا۔ مولانا انصاری مرحوم کا مسودہ کم و بیش مولانا مودودیؒ کی تحریر ہی پر مبنی تھا۔ اس دوران مولانا سلیمان ندویؒ استراحت فرما رہے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، انھوں نے دو تین جگہ جزوی ترمیم و اضافہ کیا۔ پھر اجتماع بلایا گیا۔ اس اجتماع میں سب سے پہلے اس کو پورا پڑھا گیا، پھر ایک ایک نکتے کی خواندگی ہوئی اور بالکل جس طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائل کے سربراہوں کو حجر اسود اٹھا کر دیوار کعبہ میں نصب کرنے میں شریک کر لیا تھا، اس طرح اس شرکت سے الحمدللہ یہ نکات متفقہ طور پر منظور ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی مولانا مودودیؒ اور مولانا انصاریؒ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

جب علما کی دستوری ترامیم اور سفارشات آئیں تو اس میں متفقہ طور پر جو چیزیں مرتب ہوئیں ان میں بھی مولانا مودودیؒ کا سب سے زیادہ تعمیری اور تحریری حصہ تھا، تاہم اس میں دو، تین اختلافی نوٹ بھی تھے اور وہ بہت معمولی نوعیت کے تھے۔ پھر جب ۱۹۶۱ء میں فیلڈ مارشل صدر ایوب خاں کے زمانے میں متنازع فیہ عائلی قوانین کا آرڈی ننس (MFLO) آیا تو مولانا مودودیؒ ہی نے اس پر تنقید لکھی اور اس تنقید پر علما نے دستخط کیے، اور سب کی طرف سے وہ تنقید قوم کے سامنے آئی۔ اسی طرح ایوب خان کے دستوری کمیشن کے سوال نامے کا جواب بھی مولانا مودودیؒ نے لکھا، اور پھر تمام علما اور سیاست دانوں نے اس کو دیکھا اور اس کو اپنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی صلاحیت دی تھی۔ یہ ہماری تاریخ کے مختلف سنگ میل ہیں اور ان میں سے ہر سنگ میل پر مولانا مودودیؒ کا نام اور کام ثبت ہے۔

● **جمہوریت پسندی:** خاص طور پر دینی حلقوں میں بھی اور پھر سیاسی حلقوں میں بھی ایک روایت بن چکی ہے کہ دینی حلقوں میں گدی اور سیاست میں بھی قیادت موروثی چلتی ہے۔ اور تو اور خود اب امریکہ میں بھی بڑے بش کے بعد چھوٹا بش برسر اقتدار ہے۔ اس فضا اور رواج میں مولانا نے قیادت میں تبدیلی کی مثال قائم کی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

انھوں نے جماعت اسلامی کے قیام کے فوراً بعد فرمایا: ''مجھے ایک لمحے کے لیے اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں' بلکہ میں تو اس کو ایک بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت' اس کارِ عظیم کے لیے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائض امارت کی انجام دہی کے ساتھ میں برابر تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر آدمی اس کا بار اٹھانے کے لیے مل جائے...... نیز ہمیشہ ہر اجتماع عام کے موقع پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پالیا ہے تو وہ اسے اپنا امیر منتخب کرلے۔ ان شاءاللہ' اپنی ذات کو بھی خدا کے راستے میں سدِ راہ نہ بننے دوں گا''۔ (روداد جماعت اسلامی' اول' ص ۳۴)

اس کے بعد دستور میں درج مستقل نظام کے تحت متعین وقت پر انتخاب امیر کے لیے انتخابات منعقد کرائے۔ پھر جب ۱۹۷۲ء میں انھوں نے محسوس کیا کہ اب صحت اس ذمے داری کو مزید اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تو انھوں نے رفقائے جماعت سے کہا: اب آپ میری زندگی میں اپنا نیا لیڈر منتخب کرلیں۔ ان کے الفاظ تھے: ''میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں جماعت نئے امیر پر مجتمع ہوجائے''۔ یہ ایک ایسی منفرد مثال ہے کہ جس کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ وہ شخص جو اپنی ذاتی جاگیر قائم کرنا چاہتا ہو' گدی قائم کرنا چاہتا ہو' سیاست میں اس کا کوئی ذاتی مشن ہو' وہ کبھی ایسا جراُت مندانہ اقدام نہیں کرسکتا۔ سچی بات ہے کہ جماعت کے لیے زندگی' تطہیر' قیادت' شورائیت اور صحیح راستے پر قائم رہنے کے لیے اس مثال میں بڑی عظیم رہنمائی موجود ہے جسے سید مودودیؒ کی تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیت نے پیش کیا۔

● **شورائیت اور اجتماعی اجتہاد:** مولانا کی حکمت کار میں ایک بڑی اہم چیز رچی ہوئی ہے اور وہ ہے مشورے' اجتماعیت' اختلاف رائے اور بحث و مباحثے کی آزادی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے خود اجتہاد کے بارے میں بھی کئی بار کہا ہے کہ اس کے لیے شوریٰ کا نظام اور اجتماعی اجتہاد کی سبیل پیدا ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ آج کے دور میں کسی ایک فرد کے لیے بڑا مشکل ہے کہ وہ ان تمام علوم پر جامع انداز سے گرفت رکھتا ہو' جو روزمرہ اور عصرِ حاضر میں پیش آمدہ امور پر فقہی چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ایک فرد سے یہ نہیں ہوسکتا تو پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ مختلف صلاحیتیں رکھنے والے افراد مل کر باہم مشاورت اور افہام و تفہیم (interaction) سے معاملات کو طے کریں۔

علامہ اقبالؒ نے اس مسئلے پر بحث کی ہے اور مولانا مودودیؒ بھی اس میں بہت گہرائی تک گئے ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے عصری تجربات' خصوصیت سے پارلیمنٹ کے وجود' انتخابی عمل' دستوری انداز' قانون سازی کے اسلوب' عدلیہ کی آزادی اور افراد کی آزادی اور حقوق --- غرض ان تمام چیزوں کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ پھر اسلامی راسخ العقیدگی اور قرآن و سنت سے وابستگی قائم رکھتے ہوئے نہ صرف دوسروں کو ان پر کاربند ہونے کا نہ صرف راستہ دکھایا' بلکہ خود بھی انھیں قبول کرکے دکھایا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی فکر کا یہ حرکی اور لچک دار رویہ' عصر حاضر کے مسائل و معاملات میں ہوا کا تازہ جھونکا اور فکر و دانش کے گلستان کا بہار آفریں منظر پیش کرتا ہے۔

مولانا مودودیؒ کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں ایک منفرد علم الکلام دیا ہے۔ اسی ذیل میں مولانا مودودیؒ نے مسلم تاریخ کا محاکمہ (critique) لکھا ہے جو محض محاکمہ نہیں ہے' بلکہ تاریخ کو دیکھنے کا ایک منفرد اسلوب اور زاویہ ہے۔ مولانا مودودیؒ تجدید و احیائے دین' خلافت و ملوکیت' مسلاجقہ اور تحریک آزادی ہند اور مسلمان کے علاوہ تفہیم القرآن کے اوراق میں ہمیں رہنمائی دیتے ہیں کہ ہمیں تاریخ کو کیسے دیکھنا چاہیے اور ہم اس کی تعبیر کیسے کریں؟ ہم محبت یا نفرت کے جذبے سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنے اندر عدل کی حس کو بیدار کریں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

تاریخ کے اوراق اور ادوار میں تعمیر و تخریب، اطاعت و انحراف، ظلم اور عدل، سنت اور بدعت کی موجودگی ہمیں نظر آئے، تا کہ ہر موقع پر کھلے ذہن کے ساتھ قوسِ قزح کے سب رنگ دیکھے جاسکیں۔ جہاں کہیں بنیادی اصول میں کوئی ایسا انحراف نظر آئے جو مخل نظر ہو یا قرآن وسنت کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتا ہو تو پھر اس پر تنقید بھی ہو سکے اور اس کی تصحیح بھی۔ اس کو مولانا مودودیؒ کے علم الکلام کا ایک حصہ تصور کیا جائے یا اپنی جگہ ایک مستقل علمی کارنامہ، بہر حال یہ بھی مولانا کی ایک بڑی شان دار اور نا قابلِ فراموش خدمت ہے۔

اسلامی انقلاب کا ایک منفرد ماڈل

یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے فکر بھی دی اور فکر کے ساتھ سوچنے کا اسلوب بھی دیا۔ انھوں نے اُمت مسلمہ کی ذمہ داری اور اس کا مشن متعین کیا، اس کے لیے اسے بیدار کیا اور آگاہ کیا کہ ہم محض معاشی ترقی حاصل کرنے والی ایک قوم نہیں ہیں، بلکہ ہم ایک صاحبِ مشن اور صاحب شریعت قوم ہیں۔ اس صاحبِ مشن قوم کو ملکی اور پھر عالم گیر سطح پر کامیاب کرانے کے لیے حکمت کار اور حکمتِ عملی کو پیش کیا۔ اسی حکمت کار کا ایک حصہ جماعت اسلامی کا قیام ہے، جس میں فکر ہے، اور عمل کا وسیع دائرہ ہے۔ اس طرح مولانا مودودیؒ نے اسلامی انقلاب کا بالکل نیا ماڈل دیا، اور نہ صرف ماڈل دیا، بلکہ اس کے اوپر عمل کر کے بھی دکھایا۔

مولانا کے علمی کام میں سب سے بڑا کارنامہ تفہیم القرآن ہے۔ تجدید و احیاے دین کے تصور میں قرآن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات خود مولانا نے مجھ سے فرمائی ہے: ''جب جماعت قائم ہوئی تو اس کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ اس جماعت کا تعلق قرآن سے قائم کروں اور جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے، اسے اس طریقے سے بیان کروں کہ جماعت اور پوری قوم قرآن کی روشنی کے دائرے میں آجائے، اور وہ قرآن سے تعلق قائم کر کے اس میں شریک ہو سکے، تا کہ جو تبدیلی میرے پیشِ نظر ہے اور جس کا ماخذ، جڑ اور بنیاد قرآن ہے اس تک رسائی حاصل کی جاسکے''۔ یہ وہی کام ہے جو شاہ ولی اللہ مرحوم نے اپنے دور میں کیا۔ اس طرح مولانا کی احیائی فکر کے اندر تفہیم ایک پیمانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تفہیم کی شکل میں جتنی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودیؒ کے ذریعے اس دور میں اس اُمت کو دی ہے، اس پر اپنے خالق و مالک کا جتنا شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ تفہیم القرآن مولانا کے فکری کام کا سب سے مرکزی اور سدا بہار کارنامہ (ever-lasting) ہے۔ یہ مولانا کے علم الکلام کا بھی بہترین مرقع ہے۔ اس میں مولانا کی چند اوّلیات بھی ہیں جن میں ترجمے کی جگہ ترجمانی، ہر سورہ کا مقدمہ اور پھر ترجمے میں پیراگراف بندی قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا کے فکری اور علمی اثاثے میں ایک اور چیز ان کے ہاں پائی جانے والی تازگی اور تخلیقیت (originality) ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے اور ماضی کے لکھنے والوں سے بھی استفادہ کیا، لیکن وہ دوسروں کے خیالات کے اسیر نہیں بنے، بلکہ جس طرح ایک صحت مند انسانی جسم غذا کو ہضم کر کے نیا خون بناتا ہے، اسی طرح اپنے دور اور ما قبل کے افکار سے استفادہ کر کے انھوں نے قرآن وسنت کے فہم کی روشنی میں خود تشکیلِ نو کا کام انجام دیا ہے۔

اس سلسلے میں ان کا ایک اور منفرد کارنامہ اسلام اور جاہلیت کے مابین فرق کو واضح کرنا ہے جس کے آئینے میں وہ انسانیت کی پوری تاریخ میں برپا معرکے کو پرکھتے ہیں۔ دورِ حاضر میں جن مفکرین نے بھی 'جاہلیت' کے تصور پر کلام کیا ہے، انھوں نے یہ کام مولانا مودودیؒ ہی کی جلائی ہوئی شمع کی روشنی میں کیا ہے۔ مولانا کی فکر میں جاہلیت، علم کے معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ اللہ کی ہدایت کے بغیر انسانی زندگی--- فکر و عمل کو منظم و مرتب کرنے کے مثالیہ (paradigm) سے عبارت ہے۔ اسلامی فکر کی تفہیم اور حق و باطل کی تاریخی کش مکش کو سمجھنے کے لیے مولانا کا یہ تصور ایک شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ان کی ایک نہایت بنیادی کتاب ہے، جس میں انھوں نے قرآن کی بنیادی اصطلاحات الٰہ، رب، عبادت اور دین کا صحیح مفہوم اخذ اور متعین کر کے ایک قسم کی شاہ کلید فراہم کر دی ہے، جس سے پوری اسلامی فکر کی تاریخ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی روشنی میں ہمیں قرآن فہمی کے لیے ایک روشن اور کشادہ راستہ مل جاتا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے مغربی تہذیب کے بارے میں بھی بڑا متوازن رویہ اختیار کیا۔ بحیثیت مجموعی مسلم دنیا میں اگر ایک طرف مغرب کے مکمل استرداد (rejection) کا رویہ پایا جاتا تھا تو دوسری جانب عملاً آنکھیں بند کر کے سپر ڈالنے اور معذرت خواہانہ انداز میں دین کی توجیہہ کرنے والے تھے۔ مولانا مودودیؒ نے مغربی تہذیب، اس کے اصولوں، اس کی بنیادوں، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تجزیہ کیا اور تقلید یورپ اور اندھی غلامانہ ذہنیت کو مسترد کر دیا، مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ مغرب میں ہر چیز غلط نہیں اور اس کی ترقی کے کچھ حقیقی (genuine) اسباب ہیں۔ ان اسباب سے صرفِ نظر کر کے محض اندھی مخالفت کوئی صحت مند رویہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی واضح کیا کہ مغرب سے مرعوبیت، اس کی فکری بنیادوں کو بلاتنقید قبول کر لینا اور ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کا رویہ نہ عادلانہ ہے اور نہ عاقلانہ۔ مولانا مودودیؒ نے درمیان کا راستہ نکالا۔ دیگر علما اور مولانا مودودیؒ میں یہی بنیادی فرق ہے۔

مولانا کے ہاں جو بالغ نظری، مغربی تہذیب کا فہم اور حقیقت پسندانہ طریق کار ہے، اسی وجہ سے عصرِ حاضر میں تحریک اسلامی نے مسائل کو حل کرنے کے لیے متوازن رویہ اختیار کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے یہ رویہ صرف مغربی تہذیب کے بارے میں اختیار نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کی فکریات کے بارے میں بھی ان کا رویہ یہی رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی انھوں نے حنفی مکتب فکر کو ترجیح دی اور قبول کیا ہے۔ عبادات میں اسی طریقے پر عمل کیا ہے۔ معاملات کی حد تک ان کا ذہن یہی تھا کہ چاروں مکاتب فکر کا مطالعہ کرنا چاہیے اور خصوصیت کے ساتھ جدید معاملات اور مسائل کا حل نکالنے کے لیے ان کے دائرے کے اندر جو رہنمائی جہاں سے بھی میسر آئے، اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے ان مسلمہ مکاتب فکر میں سے کسی کو مسترد یا باطل قرار نہیں دیا، بلکہ ان کے ہاں اس علمی اور عملی اختلاف رائے کو محترم تصور کرنے کا رویہ نمایاں طور پر موجود ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے شیعہ مکتب فکر سے بھی تہذیبی حد تک ربط رکھا اور اُمت کی وحدت کے لیے کوشاں رہے۔

اسی تسلسل میں اتحاد اُمت مسلمہ کے لیے ان کے ہاں ایک خاص انداز فکر پایا جاتا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ اس اتحاد کی بنیاد بہر حال اسلام ہی کو ہونا چاہیے۔ مسلمان ملکوں کے مفادات کی بنیاد پر اگر آپ یہ کوشش کریں گے تو کامیابی محال ہے۔ مفادات کا ایک جائز مقام ہے، لیکن مفادات، اسلامی مفاد اور تشخص کے تابع ہونے چاہییں۔ اس اتحاد کی کوئی ایک لگی بندھی شکل نہیں ہے۔ جیسا کہ اقبالؒ نے بھی کہا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں یہ ایک قسم کی مسلم دولت مشترکہ ہو سکتی ہے جس میں آہستہ آہستہ تعاون بڑھتا رہے اور بالآخر کوئی زیادہ مضبوط و مستحکم چیز بن سکے۔ اس سلسلے میں سعودی فرماں روا شاہ فیصل مرحوم کی 'تضامن اسلامی' کی تحریک اور پہلے مسلم سربراہی اجتماع [رباط، مراکش-۱۹۶۹ء] کے موقع پر اُمت مسلمہ کے اتحاد کے لیے جو نقشۂ کار انھوں نے پیش کیا، وہ ایک تاریخی دستاویز ہے، جس میں نظریاتی اتحاد اور عملی مسائل کے اجتماعی حل کے لیے مؤثر تدابیر اور انتظامات کی نشان دہی کی گئی۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اس حوالے سے یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا مودودیؒ نے صرف مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہی کام نہیں کیا ہے' بلکہ عملی اور فکری سطح پر اُن کی نگاہ' بلاتخصیصِ رنگ و نسل اور بلاتفریق مشرق و مغرب' تمام انسانوں پر رہی ہے۔ وہ تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے' تمام انسانوں کو جہنم کی آگ سے بچانے اور دنیا بھر کو فتنہ و فساد سے محفوظ رکھنے اور نظامِ عدل قائم کرنے کی جہانی دعوت دیتے رہے ہیں۔ تہذیبی' فکری اور ثقافتی سطح پر مولانا مودودیؒ کے مثالی اسلوبِ کار کا تجزیہ کریں تو اسے عالم گیریت یا آفاقیت پر مبنی اسلوبِ کار کا نام دیا جاسکتا ہے جس کا مقصد بنی نوع انسان کی فوز و فلاح' بہبود اور ان کی نجات ہے۔ اسی طرح اللہ سے انسانوں کے رشتے کو جوڑنا اور انسانوں کے درمیان انصاف اور اخوت کی بنیاد پر معاشرتی' معاشی اور بین الاقوامی معاملات کو حل کرنا ہے۔ جو افراد مولانا مودودیؒ کے افکار کے صرف کسی ایک جزو کو لیتے ہیں تو ان کے ہاں الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر مولانا کی پوری فکر کو لیا جائے تو اس کی حیثیت ایک ایسے گلدستے کی سی ہے جس کے سارے پھول اپنے اپنے مقام پر ہیں' اور اس گلدستے کی تصویر اُبھرتی ہی اس کے مجموعی (macro) وجود سے ہے۔

مولانا مودودیؒ بہرحال ایک انسان تھے اور ماسوا انبیاے کرام' کوئی انسان غلطی سے مبرا نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ اس زعم میں رہے کہ ان کی راے ہی صحیح ہے۔ اس کے برعکس ہمیشہ انھوں نے مکالمے اور بحث کو پسند کیا' اختلاف کو دبایا نہیں۔ اس بات کا نہ صرف اظہار کیا' بلکہ اس پر عمل کرکے دکھایا۔ کسی موقع پر اگر ان کی کسی غلطی یا دلیل کی کوئی کمزوری سامنے لائی گئی تو انھوں نے کھلے دل کے ساتھ اس سے رجوع کرلیا۔ ان کی کتاب رسائل و مسائل کا مطالعہ کریں تو اس میں ایک نہیں' دسیوں مقامات ہیں جہاں مولانا نے اپنی رائے سے رجوع کیا ہے۔ کسی صاحبِ علم کے متوجہ کرنے پر انھوں نے مسئلے یا معاملے کو چھپایا نہیں' اس کی تصحیح کی ہے اور اس تبدیلی کو خود ریکارڈ کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ اپنے فکری ارتقا میں' دورِ صحافت سے دورِ تصنیف کی طرف اور پھر دورِ اصلاح و جدوجہد کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ہر دور کے مسائل اور حالات الگ الگ تھے' جن کی مناسبت سے انھوں نے غور و فکر جاری رکھا اور اصل سے رشتے کو مضبوط رکھتے ہوئے قرآن و سنت کے نصوص پر سمجھوتا یا انحراف کیے بغیر' مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ان کی اجتہادی بصیرت' علمی دیانت اور مسائل و معاملات کے صحیح شعور و ادراک کا ثبوت ہے۔ مولانا کے افکار و خدمات اپنی انفرادیت' وسعت اور گہرائی کی بنا پر' برسوں نہیں' صدیوں تحقیق کے محتاج ہیں اور آنے والی نسلیں اس سے روشنی حاصل کریں گی---!

اللہ تعالیٰ مولانا مودودیؒ کی خدمات کو شرفِ قبولیت اور فیضانِ عام بخشے اور ہمیں ان کے مشن کو صحیح خطوط پر آگے بڑھانے کی توفیق دے۔ آمین!

☆ خواہش تو یہی تھی کہ اس موضوع پر باقاعدہ اور مفصل مضمون لکھوں' لیکن صحت کی خرابی کے باعث حسبِ خواہش یہ خدمت انجام نہ دے سکا۔ مجبوراً برادرِ عزیز سلیم منصور خالد کو کئی نشستوں میں مضمون املا کرایا اور یہ ان کی محنت کا حاصل ہے۔ ضروری ترمیم اور اضافوں کے ساتھ شمارے میں شامل کیا جارہا ہے۔ میں ان کی اس محنت اور محبت کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ جزاہ اللہ خیر الجزا۔ (خ-ا)

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library